JUNE 2009
ماہنامہ
کرن
مکمل ناول نمبر
اس شمارے کے ساتھ
کرن کتابچہ
کرن پکوان

نادیہ جہانگیر

ڈائجسٹ ناولز گروپ

وہ آم کے درخت پہ چڑھی اپنی ہی جون میں مست گنگنا رہی تھی جب کہ نیچے کھڑی اوپر دیکھتی ندا کو ٹھنڈے پسینے آرہے تھے وہ اسے بار بار چپ کرانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن وہ تو جیسے کانوں میں روئی ڈالے بیٹھی تھی۔

"آہم۔۔۔ دوسری بار پھر کوئی کھنکارا تھا لیکن وہ کیری پہ کیری توڑتی گردونواح سے بالکل ہی بے خبر تھی۔

اس نے نیچے جھانکا اور اس کی سانسیں رُک گئیں۔

وہاں نہ تو ندا کھڑی تھی اور نہ ہی زویا' آموں کی ٹوکری نیچے رکھی تھی۔

مکمل ناول

ہاتھوں پیروں سے پسینہ چھوٹا تو ٹانگوں نے وہیں کانپنا شروع کر دیا۔

"نیچے اترو۔" غصے سے سرخ چہرہ لیے وہ انگلی کے اشارے سے اسے نیچے اترنے کا کہہ نہیں رہا تھا بلکہ حکم دے رہا تھا۔ اس کی ٹانگوں کے ساتھ اس کا جسم کانپنے لگا۔

"میں نے کہا ہے نیچے اترو۔" اب کی بار لہجے میں اور گرمی آئی تھی۔ اور یہی گرمی اس کے اوسان خطا کر گئی۔

"سباس۔۔۔ میں نے کچھ کہا ہے۔" سرخ آنکھیں اور پھولا ہوا چہرا اوپر ہی اٹھا ہوا تھا۔ اس کی تو مانو جان ہی نکل گئی تھی۔

"مم۔۔۔ میں۔۔۔"

"نیچے اترو۔۔۔"

"وہ۔۔۔ وہ۔۔۔"

"نیچے اترو۔"

"نہیں اتروں گی۔۔۔" وہ تیزی سے اٹھی۔۔۔ جھولی میں موجود تمام کیریاں ایک ایک کر کے نیچے لڑھک گئیں۔

وہ یہ دیکھے بغیر کہ یہ کیریاں کس کے سر اور چہرے کی تواضع کر گئی تھیں اس نے آم کی شاخیں پکڑ کر تیزی سے اور اوپر چڑھنا شروع کر دیا۔ جب کہ نیچے کھڑے ڈاکٹر طلحہ بخاری کو یہ بھول گیا کہ وہ اوپر چڑھی سیاہ کو نیچے کیوں بلا رہا ہے۔ اس کے سر اور ناک پہ بھی

ایک ایک کیری نے اس کے ہوش اڑا کے رکھ دیے تھے۔ وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکا۔

☼ ☼ ☼

وہ نہ تو شام کو اپنے کمرے سے باہر نکلی تھی اور نہ ہی رات کو' اندر چھپ کے ایسے بیٹھی تھی کہ رات کے کھانے تک کو بھلا دیا۔

وہ بھوک کی بہت کچی تھی' وہ رات اس نے بھی کھائے بغیر نہ جانے کیسے گزار لی۔ حالانکہ ساری رات پیٹ میں چوہوں کی دوڑ جاری رہی تھی' بار بار اس کا جی چاہتا اٹھ کر چوری چھپے کچن میں چلی جائے اور پیٹ کی آگ بجھائے مگر دادی جان کی دہشت اور بڑی تائی کی وحشت نے اسے دروازے کی چٹخنی تک نہ ہٹانے دی۔

ساری رات صبر کیے بیٹھی رہی۔ دراز میں جو چند ایک بسکٹ کے ڈبے میں بسکٹ موجود تھے' وہ بھی اس کی بھوک کو کم نہ کر سکے۔ فروٹ کی ٹوکری خالی پڑی

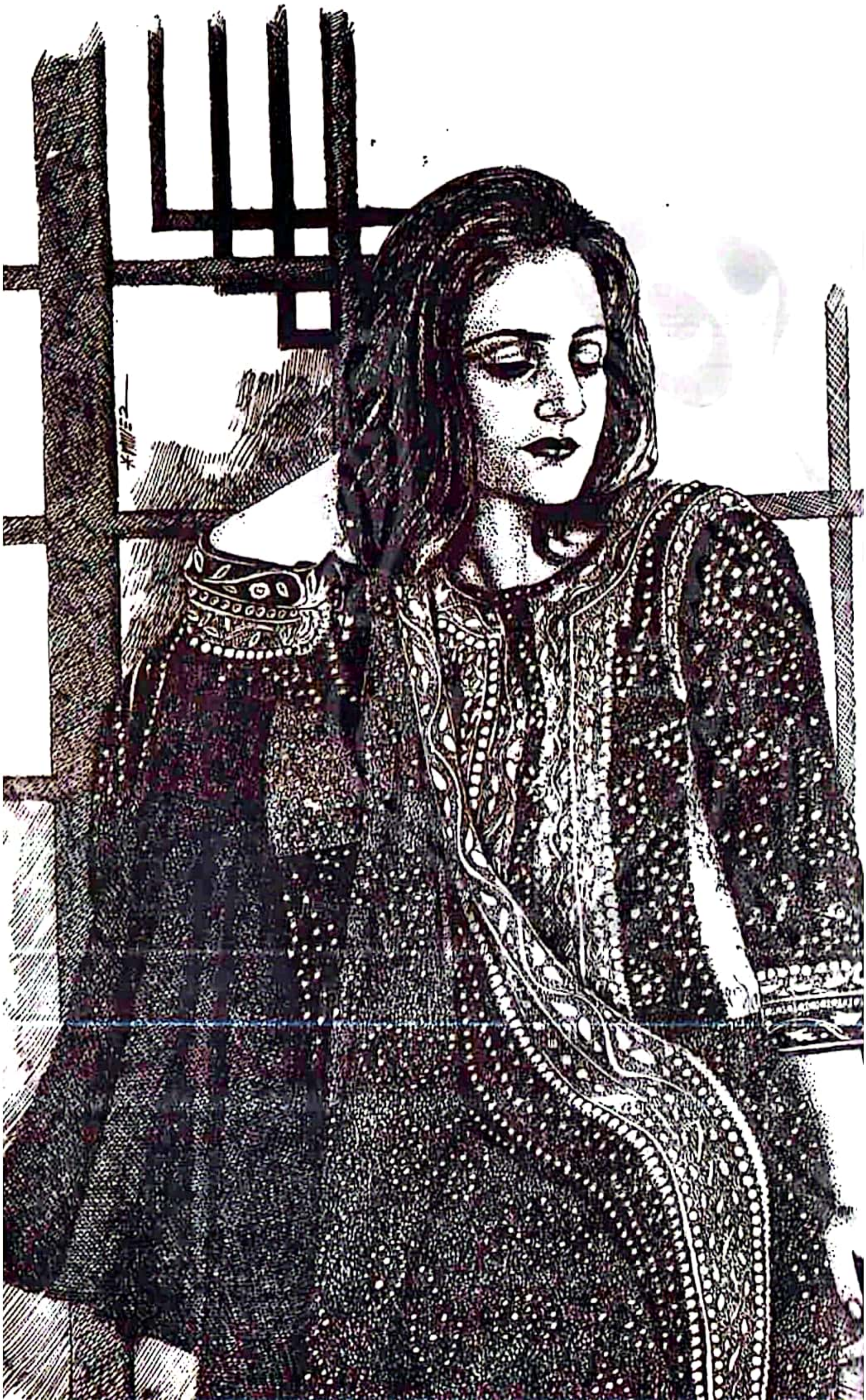

اس کا منہ چڑا رہی تھی۔

سخت بھوک کی وجہ سے رات اسے نیند ہی نہ آئی۔ فجر کے وقت وہ نماز پڑھے بغیر بستر پہ لیٹی تو نیند نے اسے دبوچ لیا۔

آنکھ تو تب کھلی جب دروازے کو بجانے کی بجائے تقریباً" پیٹا جا رہا تھا۔ کسمسا کر اس نے آنکھیں کھولیں سامنے دیوار پہ لگی کلاک نے اس کی آنکھیں ساکت کر دیں۔ ساڑھے آٹھ ہو چکے تھے۔ اور آج کالج جانا نہایت ضروری تھا۔ سوشل اسٹڈی کا بہت اہم ٹیسٹ تھا جس کے لیے اس نے بہت محنت کی تھی۔ وہ جمپ لگا کر بستر سے اٹھی۔ کپڑوں کی الماری سے تیزی سے یونیفارم جھپٹا اور باتھ روم میں گھس گئی۔

دو ہی منٹ میں وہ باہر تھی' جلدی سے شوز پہنے بالوں میں برش پھیرا' پیچھے مڑ کر بیگ اٹھایا مگر اسے چیک کرنا بھول گئی اور جاتے سے فائل تو اٹھالی مگر اندر سے غائب ہوئے کاغذات دیکھنا بھول گئی۔

تیزی سے چٹخنی گرائی' دروازہ کھولا باہر نکلی اور دوڑ لگادی' سامنے سے سیڑھیاں چڑھتے ہاشم بخاری نے بہت ناگواری سے اسے یوں کود کر سیڑھیاں پھلانگتے دیکھا تھا۔ مگر وہ ان کی ناگواری نظر انداز کرتی' انہیں زور سے سلام کرتی' دھڑ دھڑ کرتی باقی کی تمام سیڑھیاں بھی پھلانگ گئی۔

"اے لڑکی۔۔۔" بڑے ہال میں بچھے تخت پہ اونگھتی دادی' جو شاید اسی کے انتظار میں بیٹھی تھیں' کی فٹ سے آنکھیں کھل گئیں۔ وہ سرعت سے اٹھ بیٹھیں' اسے بھاگتے دیکھ کر تیزی سے آواز دی۔ مگر اس نے ان کی آواز پہ کان نہ دھرے اور دوڑنے کے سے انداز میں بڑا دروازہ کھولنے لگی۔ ابھی باہر نہ نکلی تھی کہ سائیڈ ٹیبل پہ پڑا کسی کا بلیک والٹ نظر آیا اس نے چور نگاہوں سے دادی کو دیکھا' وہ تخت کے نیچے جھکی ہوئی تھیں۔ اسے ایک بار پھر موقع مل گیا۔ کمال مہارت سے اس نے اوپر کی جیب سے دو سرخ نوٹ چرائے اور بڑا دروازہ کھولنے لگی۔ اتنے میں دادی کی شاہی چپل اس کی پشت پہ اپنا کام دکھا گئی۔ اس تڑپ کر پیچھے دیکھا۔ دادی خونخوار نگاہوں سے اسے گھور رہی تھیں۔

"ادھر آ۔۔۔"

"میں جلدی میں ہوں دادی۔۔۔"

"ٹھہرو۔۔۔ سباس۔۔۔" اس کی امی جلدی سے کچن سے نکلیں۔

"امی میں لیٹ ہو گئی ہوں۔" اس نے پیچھے مڑ کر انہیں جواب دیا۔

"ناشتا تو کر لو۔۔۔"

"زہر دے' دے اسے' کھائے اور مر جائے' کم از کم ہماری جان تو چھوٹے' بے حیا' بے شرم لڑکی سے۔"

اس کے پیچھے دادی شروع ہو گئیں' وہ کانوں میں انگلیاں ٹھونستی بھاگ کر باہر نکل گئی۔ جانتی تھی اب پیچھے امی کی خیر نہیں اور واقعی ان کی خیر نہیں تھی اگلا پورا ایک گھنٹہ ساس کی آہیں' بددعائیں اور گالیاں (جو وہ ان سمیت سباس کو دیتی رہیں) انہیں سننی پڑی تھیں۔ وہ سر جھکائے ان کی ہر بات سنتی گئیں۔

اور وہ جب کالج پہنچی تو پیروں پہ نظر پڑتے ہی چیخ مار کر رہ گئی۔ ابھی یہ چیخ ختم نہ ہوئی تھی کہ تیزی سے فائل کھولی ایک اور اندوہناک خبر اسے دھچکا لگانے کو تیار تھی' اندر سے اسائنمنٹ ہی غائب تھی۔

وہ وہیں سر تھام کر بیٹھ گئی۔ دو پریڈ پہلے ہی نکل چکے تھے' اب تیسرا بھی نکلنے والا تھا۔ وہ بے بس سی ہو کر آنکھوں میں آنسو لیے کالج کے گیٹ سے باہر نکل آئی' لیکن باہر نکلتے ایک اور سانحہ اس کا منتظر تھا۔ گیٹ کے سامنے ہی ڈاکٹر طلحہ بخاری کی سفید چمکتی سیلون کھڑی تھی۔ ڈاکٹر طلحہ بخاری بھی نکل کر باہر کھڑا تھا۔

"سباس۔۔۔" وہ واپس مڑنے لگی تھی جب پیچھے سے ڈاکٹر طلحہ بخاری نے اسے آواز دے لی۔

اس کا جی چاہا خاموشی سے چپ چاپ اندر کی طرف دوڑ لگا دے مگر وہ شاید اس کا ارادہ بھانپ گیا تھا۔ اس لیے اسے دوبارہ سے آواز دے لی۔

ناچار اسے رکنا پڑا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا اس کے پاس آن رکا' چونکہ وہ سر جھکائے کھڑی تھی۔ اس کی اپنے قریب موجودگی محسوس کر کے اس کی سانسیں بند ہونے لگیں۔ (خوف سے)

"یہ چھوٹی امی نے بھیجا ہے۔۔۔" اس نے ہاتھ میں پکڑا سیاہ بیگ اس کے سامنے کیا تو اس نے کچھ بھی کہے اور سر اوپر اٹھائے بغیر وہ بیگ پکڑ لیا۔ یہ بھی نہ پوچھا کہ اس میں کیا ہے۔

"دماغ حاضر رکھا کرو بے دماغ لوگ زندگی میں بہت نقصان اٹھاتے ہیں۔۔۔" تھوڑی سی خاموشی کے بعد وہ بولا تھا۔ اس کا لہجہ ہمیشہ کی طرح دھیما مگر سخت تھا وہ اسی طرح زمین کو گھورتی رہی۔ ماتھے پہ پسینے کے چھوٹے چھوٹے قطرے نکل آئے تھے۔

"کم عقل اور کم فہم لوگوں سے مجھے ہمیشہ سے چڑ ہے' تم اس فہرست سے نکل آؤ تو بہتر ہو گا۔۔۔" دبے دبے لہجے میں وہ بہت کچھ باور کرا گیا تھا' اس سے سر ہی نہ اوپر اٹھایا گیا۔۔۔ وہ اسی طرح سانس روکے کھڑی رہی۔ اس کی اگلی سخت بات کا انتظار کرتی رہی مگر وہ خاموش ہوا تو دوبارہ کچھ بھی نہ بولا۔

سر جھکائے اسے لگا جیسے اب وہ اسے گھورے جا رہا ہے۔ وہ اور سر جھکا کر زمین کو گھورنے لگی۔ اس وقت اسے اپنی عقل پہ رونا آیا جب اسے گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی اس نے سر اوپر اٹھایا مگر تب تک گاڑی بہت آگے جا چکی تھی۔۔۔ بے اختیار اس نے ایک گہرا سانس لیا تھا۔

"یہ چنگیز خان کیا دے گیا ہے مجھے۔۔۔" اس کے جاتے ہی اسے ہاتھ میں پکڑے بیگ کا خیال آیا تھا' اس نے فوراً" بیگ کھولا اور پھر یکدم مسکرا دی۔

اسائنمنٹ' پین' پنسل' کیلکولیٹر' موزے۔۔۔ مع اخبار میں لپٹے ایک عدد برگر کے۔

"جیو میری ماں۔۔۔" بے ساختہ اس نے نعرہ لگایا تھا۔

☆ ☆ ☆

"سلام دادی۔۔۔" وہ کالج سے لوٹی تو دادی کو اپنی مخصوص نشست پہ بیٹھے پایا۔ اس وقت وہ بڑے تخت پہ براجمان سرخ تکیے سے ٹیک لگائے سامنے کھلے پاندان پہ جھکی ہوئی تھیں' اس کے لٹھ مار انداز پہ وہیں اچھل کر رہ گئیں وہ ان کے اس انداز پر قہقہہ لگا کر ہنس دی۔

"دستیاناس ہو تیرا بد تمیز لڑکی۔۔۔ لے کے میری جان نکال دی۔۔۔" دادی سینے پہ ہاتھ رکھ کر بڑے بڑے سانس لینے لگیں۔

"کیا ہے دادی' میں نے اتنی چاہت سے آپ کو سلام کیا ہے۔ مگر آپ بھی نا۔۔۔" وہ دھم سے ان کے پاس گر گئی۔

"کیا میں۔۔۔ ہوں بولو کیا میں۔۔۔ کان کھول کر سن لو لڑکی' حیا دار لڑکیوں کے لچھن تمہارے جیسے نہیں ہوتے۔۔۔ اچھا تھا تیری ماں تیرے پیدا ہوتے ہی تیرا گلا گھونٹ دیتی۔۔۔"

"دادی آپ کو تو مجھ سے مفت میں ہی اللہ واسطے کا بیر ہے۔۔۔ ورنہ میں نے تو آپ کو صرف سلام ہی کیا تھا۔" وہ ابھی تک اپنا کندھا سہلا رہی تھی۔

خواتین ڈائجسٹ
کی طرف سے
بہنوں کے لیے ایک اور ناول
ساگر، دریا، بادل، بوند
رضیہ جمیل
قیمت۔۔۔ -/300 روپے
منگوانے کا پتہ
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37- اردو بازار، کراچی۔

"سباس' اٹھو یہاں سے۔۔۔" اس کی ماں جو ابھی ابھی باہر نکلی تھیں۔ دادی کو اس کے ساتھ الجھتے دیکھ کر تیزی سے آگے بڑھیں۔

"ہاں۔ یہ سب تیری ہی شہ ہے۔ تو ہی اسے پڑھاتی ہے میں جانتی ہوں یہ سب تیرا ہی کیا دھرا ہے۔" ان کی توپوں کا رخ فوراً" سمانہ بخاری کی طرف مڑا۔

"سباس اندر چلو۔" سمانہ بخاری نے فوراً" اسے بازو سے پکڑ کر اندر دھکیلا اور خود اس کا بیگ اٹھالیا۔

"کیوں کرتی ہے تو ایسا۔" اندر آکر انہوں نے بہت دکھ سے اس سے کہا۔

"امی قسم سے میں نے کچھ نہیں کیا دادی خوا مخواہ ہی۔۔۔" وہ پہلے ہی افسردہ تھی۔

"خوا مخواہ نہیں۔۔۔ تو نے ضرور کچھ کیا ہے ورنہ وہ اتنا غصہ نہ ہوتیں۔" انہوں نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔

"ان کو تو بس عادت ہے۔۔۔" اس نے شوز اتار کر دور پھینکے۔

"شٹ اپ سباس۔۔۔ میں نے تمہاری ایسی تربیت تو نہیں کی۔۔۔" انہوں نے ناگواری سے اسے ٹوکا۔

"امی' قسم سے دادی خوا مخواہ مجھ سے الجھتی ہیں۔۔۔"

"تو تم ہی منہ بند کرلیا کرو"

"مجھ سے نہیں منہ بند ہوتا۔۔۔"

"منہ بند کرنا ہی پڑتا ہے سباس۔۔۔" ان کا لہجہ گلوگیر ہوگیا۔ اس نے تڑپ کر انہیں دیکھا۔

"دونوں ماں بیٹی ایک دوسرے کو دیکھ کر سر جھکا گئیں۔ اس کے بعد کمرے میں بہت خاموشی رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

یونیفارم چینج کرنے کے بعد وہ پچھلے لان میں نکل گئی جہاں ندا' عالی' زویا' مبشرا' غنی' علی اور عاصمہ بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ وہ ابھی پچھلے دروازے سے نکل ہی رہی تھی کہ انجانے میں ہی کسی سے ٹکرا گئی۔ سر پہ چوٹ لگی تھی وہ چیخ کر رہ گئی۔

"دیکھ کر نہیں چل سکتے۔۔۔"

"نظر تو تمہیں نہیں آتا۔۔۔" بھاری سخت لہجہ اس کی سماعتوں میں کیا پڑا وہ اچھل کر رہ گئی۔ سر اوپر اٹھا کے دیکھا ڈاکٹر طلحہ بخاری' اسے ہی گھور رہا تھا اس کی جان ہوا ہوگئی۔

"وہ میں جان بوجھ کے تو نہیں۔۔۔" وہ منمنائی۔

"تم ہمیشہ انجانے میں ہی سب کچھ کرتی ہو۔" اس کا لہجہ سخت تھا۔

"آپ مجھے نادم کررہے ہیں؟"

"تم میں ندامت نام کی کوئی شے ہے؟" الٹا اس سے پوچھا گیا۔ وہ پہلو بدل کر رہ گئی۔

اس گھر میں تو کسی بڑے کی اتنی جرأت نہ تھی کہ ڈاکٹر طلحہ بخاری کو کوئی سخت بات کہتا وہ تو پھر ایک لڑکی تھی اور وہ بھی سباس۔ جو اس کی نصف بہتر تھی اس پہ تو اس کی دہشت اور خوف تو ویسے بھی سوار رہتا تھا۔

"سباس ایسا کچھ مت کیا کرو کہ مجھے بار بار تمہیں ٹوکنا پڑے' بہت غصہ آتا ہے مجھے تمہاری ان فضول حرکتوں پر' میں نہیں چاہتا کہ تمہیں خود اپنے ہاتھوں سے اگلے جہاں بھیجوں' سدھر جاؤ تو اچھا ہے۔" ناگواری سے کہتا وہ ایک طرف ہٹ گیا۔ وہ اس کی پشت گھورتی رہ گئی۔ بعد میں اسے یاد آیا کہ ڈاکٹر صاحب کی ناک پہ تو سنی پلاسٹ لگا ہوا ہے' ماتھے پہ بھی کچھ اسی طرح کی چیز تھی۔

"کمال ہے مجھے پتا ہی نہ چلا ڈاکٹر صاحب تو بیمار پھر رہے ہیں۔۔۔ لیکن انہیں ہوا کیا؟" خود ہی بڑبڑاتی ہوئی وہ ندا و عیرہ کی طرف چلی آئی۔

"آؤ ہمارا شیر آیا۔۔۔" اسے دیکھتے ہی عالی نے نعرہ بلند کیا تو سب ہی اسے دیکھ کر مسکرانے لگے۔

"شیر نہیں ببر شیر۔۔۔ ڈاکٹر صاحب کو ناکوں چنے چبو

ں اہر شیر کا ہی کام ہے۔" زویا نے ہنستے ہوئے بات اضافہ کیا وہ عنی کی چھوڑی ہوئی چیئر پر بیٹھ گئی۔

"ویسے سباس تم نے کیریوں سے ڈاکٹر صاحب کی ہے تواضع کی۔"

"کیا؟" وہ ناسمجھی سے انہیں دیکھنے لگی۔

"یار کل جو تم نے ان کے سر اور چہرے پہ کیریوں ے ڈھول بجائے تھے' یہ اسی کی بدولت آج چھٹی ار رہے ہیں۔"

ندا نے اس کا کندھا تھپکا تو اسے کل والا واقعہ تمام جزئیات سمیت یاد آگیا اور یہ بھی یاد آگیا کہ ندا اور یا اسے شیر کی کچھار میں اکیلا چھوڑ کر خود بھاگ گئی یں اس لیے اس نے بجائے خوش ہونے کے انہیں ھور کر دیکھا تھا۔

"بہت مطلب پرست لوگ ہو تم..." اس نے ندا و گھورتے ہوئے کہا۔

"مجھے درخت پہ تم دونوں نے چڑھایا' اور جب مجھ مصیبت آئی تو مجھے اکیلا چھوڑ کر بھاگ نکلیں' کتنے بیث ہو تم لوگ... ذرا شرم نہ آئی مجھ غریب کو اکیلا ھوڑتے ہوئے۔" زویا اور ندا کو گھورتے ہوئے اس نے انہیں شرم دلائی تو وہ دانت نکالنے لگیں۔

"تو تمہیں کس نے کہا تھا اوپر چڑھ کر ہیروئن کی طرح بے ہودہ ——— گانے گاؤ۔ تم تو اپنی ہی جون ں مست تھیں' نیچے جو ہماری حالت ہوئی' اس سے ہم ی واقف ہیں' اتنے بے ہودہ شعر تھے تمہارے اس نے کے کہ شریف لوگ اسے گانا تو ایک طرف سننا گوارا نہ کریں۔" ندا نے الٹا اسے لتاڑا۔

"تو تم مجھے چپ کرا دیتیں نا..."

"اے ہے ندا نے لاکھ ہش ہش کیا مگر تم تو کان لپیٹے وئے تھیں۔ مجال ہے جو ہماری آواز بھی تم نے سنی و۔" زویا بھی گویا اسے آئینہ دکھانے کے موڈ میں تھی وہ اسے گھور کر رہ گئی۔

"چھوڑو لیڈیز... لنچ کا ٹائم ہو گیا ہے' اٹھو اور اندر ل کے کھانے پہ ٹوٹ پڑو..." عنی نے اس بحث کو ٹمٹنا چاہا۔

قہقہوں سے گندھی ہوئی تحریر۔
اداس اور غمگین قارئین کے لیے
ایک غم گسار کہانی

وہ غائب ہونا چاہتا تو حاضر ہو جاتا
حاضر ہونا چاہتا تو غائب ہو جاتا
ایک مردِ بدحواس کی داستانِ حیرت
شگوفے، پھلجھڑیاں اور تماشے

حاضر غائب

اظہر کلیم ایم اے

قیمت: -/300 روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی

"چلو بھئی کھانے کا ویسے بھی ٹائم ہو گیا ہے۔" اس کے اشارے پہ سب ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ندا کیا واقعی ڈاکٹر صاحب کے چہرے پہ میرے ہی بخشے ہوئے نشان ہیں۔" اندر جاتے ہوئے اس نے ندا سے پوچھا تھا۔ جواب مثبت ملا۔

"دادی اور امی بہت غصے میں تھیں شکر ہے رات تم باہر نہیں نکلیں' ورنہ تمہاری خیر نہیں تھی۔ دادی تو ساری رات تمہاری امی سے لڑتی رہیں' چاچو کہ بھی تم پہ بہت غصہ تھا۔"

"نہیں مجھ پہ غصہ کب نہیں ہوتا۔" اس نے لاپروائی سے کہا' ندا اسے دیکھے گئی۔ جبکہ وہ حیران تھی کہ صبح وہ اس کے کالج گیا تھا' اس نے اس کے چہرے کو دیکھا کیوں نہیں' اگر دیکھ لیتی تو یقیناً" اس کی آج کی صبح پہلے سے بھی زیادہ خوش گوار گزرتی۔ یہ اور بات اس کی دوپہر اور پھر شام بھی بہت خوش گوار ہو گئی تھی۔ وہ پارٹ ٹائم جاب کرتی تھی۔ آفس میں بھی اس کا سارا وقت بہت خوشگوار گزرا۔

☆ ☆ ☆

ڈاکٹر طلحہ بخاری کا سر بہت بھاری ہو رہا تھا وہ کب سے یونہی اکیلے کمرے میں پڑا تھا۔ آغا جان اس کے کمرے میں آئے تو اس کی خراب طبیعت نے انہیں پریشان کر دیا۔ وہ کچھ دیر تو اس کے پاس بیٹھے رہے پھر اٹھ کر باہر چلے گئے۔ باہر نکلتے ہی ان کی نظر کوریڈور میں بچھی کرسی پہ بیٹھی سباس پہ پڑی تھی' وہ سیدھے اس کی طرف چلے آئے وہ انہیں اپنے قریب آتا دیکھ کر سیدھی ہو بیٹھی' ہاتھ میں پکڑی کتاب کو جان بوجھ کر آنکھوں کے سامنے کر لیا۔

وہ اس کی اس حرکت کو بھانپ گئے۔ اس لیے پہلے تو کھنکارے مگر اسے متوجہ ہوتا نہ دیکھ کر اس کے ہاتھ سے کتاب جھپٹ لی۔

"اوہ... آغا جان آپ...؟" مصنوعی حیرت سے انہیں دیکھا تو وہ اسے گھورنے لگے تو وہ گڑبڑا گئی کہ ضرور کچھ غلط ہو گیا ہے۔

"میں نے تم سے ایک بات کرنی تھی۔"

"کون سی..." اس نے حیرت سے آنکھیں پٹپٹائیں۔

"کہ اپنے شوہر کا خیال رکھا کرو۔"

"وہ تو میں رکھتی ہوں۔" اس نے تیزی سے کہا' سفید عدسوں کے پیچھے سے جھانکتی آنکھوں میں صاف بے یقینی اتری۔

"ابھی وہ کہاں ہے؟"

"ہسپتال۔"

"لوٹا نہیں؟" انہوں نے اسے گھورا۔

"ہو سکتا ہے لوٹ آئے ہوں۔" وہ گڑبڑائی۔

"تم نے دیکھا نہیں؟" ان کے ماتھے پہ بل پڑ گئے۔

"فضول لوگوں کو دیکھنے کے لیے میرے پاس ٹائم نہیں۔" وہ بڑبڑائی۔

"لڑکی میں نے تمہیں کتنی بار سمجھایا کہ شوہر کے دل میں جگہ بنانے کے لیے اس پہ توجہ دینی پڑتی ہے اس کا دھیان رکھنا پڑتا ہے۔"

"میں کیوں دوں اس جلاد پہ توجہ' کیوں دوں اس کا دھیان۔" وہ پھر بڑبڑائی تو وہ گھور کر اسے دیکھنے لگے۔ سر جھکا گئی۔ اب اتنی بھی بے ادب نہیں تھی کہ ان کے سامنے ہی اسے برا بھلا کہنے لگتی۔

"مجھے تم سے بہت اچھی توقعات وابستہ تھیں۔" انہوں نے یوں کہا جیسے ان کے بہت سے ارمان ٹوٹ گئے ہوں۔

"لیکن آغا جان انہیں بھی تو دیکھیں... کتنا ناپ کرتے ہیں وہ مجھے... پھر میں کیوں؟"

"یہ تمہاری غلط فہمی ہے سباس... وہ میرا پوتا اور میں اسے اس سے بہتر جانتا ہوں۔"

"یہ تو آپ کی غلط فہمی ہے آغا جان..."

"اوں۔ ہوں لڑکی' آگے سے چڑھائی مت کیا کر۔ کبھی آرام سے اگلے کی بات بھی سن لیا کرو۔" انہوں نے اسے ٹوکا تو وہ نہ چاہنے کی باوجود چپ ہو گئی۔

"اب اندر وہ بیمار پڑا ہے' کب سے اس کے سر میں درد ہے' تم سے یہ بھی نہ ہوا کہ اسے چائے پانی کا

لو۔ پچھلے دو گھنٹے ہو گئے ہیں اسے ہسپتال سے لے ہوئے۔"

"آغا جان وہ میرے ہاتھوں سے لے کے کوئی چیز بھی نہیں کھاتے۔۔۔ اس لیے تردد کرنا فضول ہے چاہے ان کی پسندیدہ چیز ہی میں نے بنائی ہو وہ اسے بھی یوں پسند کرتے ہیں جیسے مجھے۔"

"خود ساختہ خیال مت پالو سباس' یہ انسان کو لے بیٹھتے ہیں۔"

"آغا جان۔۔۔" وہ ان کے قریب ہوئی۔۔۔

"یہ خود ساختہ خیال نہیں ہیں۔ آپ نے ان کے ساتھ بھی ناانصافی کی ہے۔ کاش آپ گھر والوں کی بات مان لیتے۔۔۔" اس کا گلا رندھا تو آغا جان نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا اس کی آنکھوں میں پانی آیا تھا جو اس نے کمال مہارت سے پیچھے چھپا لیا۔ مگر آغا جان سے وہ پانی چھپ نہ سکا۔

✲ ✲ ✲

وہ آنکھوں پہ بازو رکھے لیٹ تھا' جب وہ دروازہ ناک کیے بغیر اندر چلی آئی کھٹکے کی آواز پہ وہ بازو آنکھوں پر سے ہٹا کر دیکھنے لگا۔ اس پہ نظر پڑتے ہی اس کی فراخ پیشانی پہ ان گنت شکنوں کا جال بن گیا۔ اور وہ ان شکنوں سے تو ہمیشہ ہی سے خائف رہتی تھی اب جو کشادہ چمکتا ماتھا لکیروں سے بھرا دیکھا تو ہاتھ میں موجود چائے کے کپکپاتے کپ کے ساتھ خود بھی کانپ کر رہ گئی۔

"کیا تکلیف ہے؟" وہ دہاڑنے کے سے انداز میں بولا اور سہم گئی۔ ڈر کے پہلے پیچھے دیکھا اور پھر اس کی خوفناک آنکھوں میں۔

"وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ یہ چائے اور پین کلر۔۔۔" وہ ہکلائی۔

"کس کے لیے ہیں۔۔۔" ماتھے کی گھوری لہجے کی ان۔ اور آنکھوں کی وحشت اس کی جان لے گئی۔

"آ۔۔۔ آ۔۔۔ آپ کے لیے۔"

"میں نے مانگی ہیں۔۔۔" لہجے میں پتھر کی سی سختی تھی۔

"نہیں۔۔۔" وہ گڑبڑائی۔ دو قدم اور آگے بڑھ کر اس کے پیروں کے قریب پڑی ٹیبل پہ چائے رکھنا چاہی۔

"تو پھر۔۔۔؟؟"

اس نے کپ نیچے نہیں رکھا۔

"آپ کے سر میں درد ہے نا۔۔۔" کمال معصومیت سے بولی۔

"تو تمہیں کس نے مدد کے لیے بلایا ہے؟"

"وہ تو میں خود۔۔۔"

"خدائی فوجدار بننے چلی ہو؟" تڑخ کر پوچھا اس کی بولتی بند ہو گئی۔

"سباس بی بی مجھے اتنا مت ستاؤ کہ میں کوئی انتہائی فیصلہ کرنے پہ مجبور ہو جاؤں' بہتر ہے اس قسم کی گھٹیا۔ حرکتوں سے باز آجاؤ۔۔۔" اس کی طرف ناگواری سے دیکھتے ہوئے اس نے کہا تو وہ تڑپ کر اسے دیکھنے لگی۔

"اس قسم کی گھٹیا حرکت کے لیے آغا جان نے کہا ہے۔ ورنہ مجھے ایسا کوئی شوق نہیں ہے۔۔۔" جواباً وہ بھی چیخی تھی۔ اور سچ سچ بتا دیا۔

"آغا جان نے یہ بھی کہا ہوگا کہ دروازہ ناک نہیں کرنا۔۔۔ بنا اجازت کے اندر گھس جانا۔۔۔" بہت غصے سے اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"میں نے ناک کیا ہے' اب آپ کے کان ہی میری آواز سننے کے متحمل نہیں ہیں تو اس میں میرا کیا قصور۔" وہ بھی مشتعل ہوئی۔

"سباس مجھے جھوٹ سے نفرت ہے۔"

"اور مجھے آپ جیسے لوگوں سے نفرت ہے جو خوامخواہ دوسروں پہ اپنا رعب جماتے ہیں' دوسروں کو مرعوب کرنے کے لیے خود پہ ہمہ وقت دوسرا روپ چڑھائے رکھتے ہیں' بہروپیے کہیں کے۔۔۔" اس پہ جب غصہ سوار ہوتا تھا تو وہ بہت فضول بول جاتی تھی اب بھی اس کا دل چاہا اسے کھری کھری خوب سنائے مگر اتنا جانتی تھی سامنے کوئی اور نہیں ڈاکٹر طلحہ بخاری ہے جو اس قسم کی باتیں قطعی ناپسند کرتا ہے اور اس کی باتوں کی تو بات ہی کچھ اور تھی۔ بولتی وہ بعد میں تھی۔

اسی لیے مزید کچھ کہتے کہتے رک گئی' اپنے چائے لانے پہ دو حرف لعنت کے بھیج کر وہ واپس مڑنے لگی تھی کہ اس کا پیر کارپٹ میں الجھ کر رہ گیا' وہ گرتے گرتے بچی مگر ہاتھ میں پکڑے — کپ کو نیچے گرانے سے نہ بچا سکی جو سیدھا ڈاکٹر طلحہ کے پیر پہ گرا تھا' گرم گرم چائے اس کے پیر کو جھلسا گئی۔ وہ تیزی سے سیدھا ہوا تھا۔

"کیا بے ہودگی ہے۔"

"وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ میں۔۔۔ میں نے جان بوجھ کے تو نہیں گرائی۔"

"سسباس۔" وہ دہاڑا۔۔۔

"اپنی حرکتوں سے باز آجاؤ۔۔۔" وہ پیر مسلنے لگا۔ تو وہ اس پہ جھکی اس نے سر اٹھا کے بہت غصے سے اسے دیکھا۔

"بہت برا کر رہی ہو تم اپنے ساتھ۔۔۔ اپنی یہ عادت بدلو' رہنے اور جینے کے لیے بہت کچھ سیکھنا پڑتا ہے' اپنی عادتیں بدلو' مجھے یہ سب کچھ پسند نہیں ہیں جو تم کرتی ہو۔" نہ جانے اسے کس بات پہ غصہ آیا تھا جو اسے اتنا سب کچھ سنا گیا اور وہ سر جھکائے فرش کو گھورتی چپ چاپ اسے سنے گئی' وہ آگے سے بولنا چاہتی تھی۔ اسے جواب دینا چاہتی تھی' مگر کئی ان دیکھی زنجیریں اس کی زبان کو جکڑ گئیں۔ وہ خاموشی سے پیچھے ہٹ گئی۔

"اگر مجھے آغا جان کا احساس نہ ہوتا تو شاید اب تک میں وہ کر چکا ہوتا جو میرے دل میں ہے۔ نہ جانے آغا جان نے مجھ سے کس غلطی کا اتنا بڑا بدلہ لیا ہے۔" اس نے نخوت سے سر جھٹکا۔ وہ ہونٹ کاٹنے لگی۔

"اب کیوں کھڑی ہو یہاں۔" وہ ایک بار پھر سر اٹھا کر بہت غصے سے اسے دیکھنے لگا۔

"وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ میں۔"

"دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" وہ غصے سے دہاڑا تو وہ ہونٹ کاٹتی تیزی سے واپس مڑی اور باہر نکل گئی۔

سامنے ہی آغا جان کرسی پہ بیٹھے اخبار دیکھ رہے تھے۔ اس کے باہر نکلتے ہی وہ اس کی طرف دیکھنے لگے۔

اس نے ایک پل کے لیے آنکھیں اوپر اٹھا کر انہیں دیکھا اور پھر تیزی سے باہر نکل گئی۔ ان آنکھوں میں شکایت تھی۔

☆ ☆ ☆

"قاسم تم ہی طلحہ کو سمجھاؤ اس نے میری بات مان تو لی ہے لیکن نہ جانے کیوں وہ سباس کو قبول نہیں کر پا رہا ہے۔"

اس وقت آغا جان بڑے کمرے میں دادی جان کے پہلو میں بیٹھے اپنے بڑے بیٹے سے گفتگو کر رہے تھے کہ دادی پہلو بدل کر رہ گئیں۔

"بخاری صاحب اب بھگتیں آپ۔۔۔ بچوں کے ساتھ زبردستی کرنے کا یہی نتیجہ ہوا ہے میں تو پہلے ہی سے جانتی تھی اس کا نتیجہ یہی ہوگا۔"

"مہربانو آپ درمیان میں نہ ہی بولیں تو بہتر ہے۔" انہوں نے سر موڑ کر انہیں ٹوکا تو وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگیں۔

"ابھی تو شروعات ہیں' آگے آگے دیکھیے گا' آپ کو صاف نظر آئے گا کہ زبردستی کا انجام کیا ہوتا ہے۔ اس وقت تو میں بری ہوں' بعد میں آپ کو اپنا بھی پتا چل جائے گا۔"

"مہربانو مت بھولیں قاسم کی شادی بھی آپ نے زبردستی ہی کرائی تھی۔"

"ہاں کرائی تھی کنیز فاطمہ کو رہنے اور زندگی گزارنے کا شعور تھا' عقل تھی' وہ جانتی تھیں گھر کیسے بچایا جاتا ہے لیکن یہاں تو۔۔۔ منہ بند کرو تو خالی' کھلا صاف۔۔۔"

"جیسی ماں ویسی بیٹی۔"

"اماں جان پلیز۔ آپ نیا محاذ نہ کھولیں' آغا جان بات کرنے دیں۔" قاسم بخاری نے کن انکھیوں سے ہاشم بخاری کو جو درمیانی صوفے پر براجمان تھے' بدلتا دیکھ کر فوراً" ماں کو ٹوکا۔

"ہاں تم تو یہی کہو گے' تم دونوں باپ بیٹا ہو ہی ایک

لعالی کے بینگن۔ میرے بیٹے کی زندگی تباہ کردی۔ میرا تو کلیجہ کٹ جاتا ہے جب اس کی صورت دیکھتی ہوں کتنا اس مکھ، چنچل، چلبلا ہوتا تھا جب سے وہ ڈائن اس کے پلے پڑی ہے میرا بیٹا تو مسکرانا ہی بھول گیا۔ خوش رہنا کیا ہوتا ہے، یہ اسے یاد ہی نہیں جب دیکھو افسردہ افسردہ سا رہتا ہے اس موئی صورت والی نے اسے کہیں کا نہیں چھوڑا تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔"

"مہربانو۔" آغا جان بولے تو مہربانو وہیں زبان روک گئیں۔

"جو کرتی ہیں آپ ہی کرتی ہیں۔ اس کا دل اور ذہن آپ نے ہی خراب کر رکھا ہے، ورنہ کیا کمی ہے سمانہ میں۔"

"ارے مرد کو اترن کبھی پسند نہیں آتی بخاری صاحب۔"

"اماں جان۔" قاسم نے سختی سے انہیں ٹوکا۔ "آپ بات کو کس رخ پہ لے جا رہی ہیں۔"

"ہاں باپ کی سائیڈ لے کر دہاڑو مجھ پہ، چلاؤ مجھ پہ۔" وہ خوامخواہ غصہ ہوئیں۔

"اماں جان پلیز، آغا جان جو بات کر رہے تھے انہیں وہ بات مکمل کرنے دیں آپ آرام سے بیٹھیں۔ مسائل کو سلجھانے کی بجائے الجھایا نہیں جاتا۔" انہوں نے سہولت سے انہیں سمجھانا چاہا مگر وہ بھی اپنے نام کی ایک تھیں۔

"ارے جاؤ، جاؤ، عقل کا گھاٹا تو تم میں شروع سے ہی ہے ہمیشہ باپ کے کہے پہ چلتے ہو۔"

"مہربانو اگر خاموش بیٹھنا ہے تو بیٹھیں ورنہ جائیں کسی بہو کے پاس بیٹھ جائیں، ہم پہلے ہی پریشان ہیں ہمیں مزید پریشان مت کریں۔" آغا جان نے ذرا سختی سے کہا تو وہ ہاشم بخاری کو دیکھنے لگیں جو صوفے کی پشت سے سر ٹکائے ہونٹ کاٹتے اپنا ماتھا مسل رہے تھے۔

"میرا بیٹا... میری جان..." انہوں نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

"آغا جان آپ پریشان نہ ہوں۔ میں طلحہ سے خود بات کروں گا بہت سمجھدار بچہ ہے۔ سمجھ جائے گا۔"

"میں بھی سمجھدار تھا، سب سمجھ گیا تھا۔ طلحہ بھی سمجھ ہی جائے گا۔" ہاشم بخاری بولے تو وہ باپ بیٹے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

"جس طرح ساری زندگی میں خوش رہا ہوں۔ وہ بھی خوش رہے گا۔"

"دعا کرو وہ تمہاری بیٹی کو خوش بھی رکھ سکے۔" آغا جان نے جان بوجھ کر خوشدلی سے بولے۔

"میری بیٹی..." انہوں نے سر جھٹکا۔

"تمہاری ہی بیٹی ہے نا۔"

"آپ بہتر جانتے ہیں۔" انہوں نے تلخی سے کہا تو وہ باپ بیٹا بالکل ہی خاموش ہو گئے جبکہ کچن میں کھڑی سمانہ فریج سے پانی کی بوتل نکال کر ہونٹوں سے لگاتی سباس سے نظریں چرا رہی تھیں اور سباس چاہ کر بھی حلق میں گیا پانی کا گھونٹ نیچے نہیں اتار پا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس کے فائنل ایگزامز شروع ہونے میں صرف دو دن تھے، وہ پڑھائی پہ توجہ دے رہی تھی، عنی اور عالی بھی اپنے اپنے ایگزامز میں مصروف تھے۔ ندا بھی اسی کے ساتھ تھی اسی لیے گھر میں ان چاروں کی غیر موجودگی کو شدت سے محسوس کیا جا رہا تھا۔

حالانکہ وہ چاروں ہوتے گھر پہ تھے مگر اپنے اپنے کمروں میں بند، ایک دوسرے سے بے خبر بلکہ اپنے آپ سے بھی بے خبر ہوئے وہ چاروں ہی پڑھائی میں جتے ہوئے تھے اسی لیے تو انہیں بہت اہم واقعے کی خبر ہی نہ ہو سکی۔ حالانکہ اس سے پہلے ایسی خبریں سباس کے کانوں میں پہنچتی تھیں اور وہ انہیں خوب نمک، مرچ اور مسالا لگا کر دوسروں کو سناتی تھی۔ اب کی بار گھر میں افواہ اٹھی تو سباس ہی اسے سننے سے محروم رہی۔ وہ تو بھلا ہو زویا اور مبشرا کا جو انہوں نے ان چاروں کو کانوں سے پکڑ کر ایک کمرے میں جمع کیا اور اس خوفناک، اندوہناک خبر کا دھماکا کر دیا۔ وہ تینوں تو

خوش سے جھوم اٹھے جب کہ وہ گم سم سے ہو گئی۔
"اے۔ کیا ہوا۔ یوں چپ چاپ کیوں ہو گئی ہو؟" ندا نے اسے ٹھوکا دیا تو وہ مسکرا دی۔
"یہ ہوئی نا بات۔ اب دیکھتے ہیں ڈاکٹر صاحب تمہاری پہنچ سے کیسے بچتے ہیں۔" زویا نے ہاتھ جھاڑے تو عالی آگے بڑھا۔
"ان کی کھڑی ناک اتار کے نیچے رکھ دینا ایک ہی دن میں' بڑے مغرور بنے رہتے ہیں' خود کو نہ جانے کیا شے سمجھتے ہیں' پھنے خان۔"
"میری بات مانو تو انہیں ایسے ہاتھوں پہ ڈالنا کہ پھر اترنا بھول جائیں۔ اس کے ایسے ہوش و حواس پر چھانا کہ وہ دائیں بائیں دیکھنا بھی یاد نہ رکھیں' انہیں اچھی طرح قابو کرنا۔" مبشر نے اسے ایک اور مخلص مشورے سے نوازا تھا۔
"میری مانو تو انہیں لفٹ ہی نہ کرانا خود ہی زمین پہ آجائیں گے۔" عاصمہ کو شاید طلحہ پہ کچھ زیادہ ہی غصہ تھا۔
"اے ہے الٹی عقل والی' الٹا ہی مشورہ دینا' اگر اس نے انہیں لفٹ نہ کرائی تو انہیں قابو کیسے کرے گی۔" عالی کچھ زیادہ سمجھ دار تھا۔ آنکھیں پٹپٹا کر بولا۔
"ارے... خیشو..... شرم کرو' شرم۔" غنی تڑپ کر چلایا تھا' وہ سب حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔
"کیلی اس کی رخصتی نہیں ہو رہی' ساتھ میری بھی تو شادی ہے۔"
"تو...؟"
"تو مجھے بھی تو چھیڑو۔" وہ شرما کے بولا تھا۔ سب کی ہی حیرت سے آنکھیں پھٹ گئیں۔
سب یوں چپ ہوئے جیسے سب کو سکتہ ہو گیا پھر سب سے پہلے عاصمہ کو ہوش آیا تھا اس نے فٹ دوپٹے کا کونا دانتوں میں دبا لیا جبکہ باقی سب نے ان دونوں کی کشنز سے پٹائی کرنا شروع کر دی تھی۔

☆ ☆ ☆

آغا جان کو نہ جانے کیا سوجھی' انہوں نے قاسم بخاری کے ساتھ مشورہ کر کے گھر میں ان چاروں کی شادی کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان نے سب کو ہی ہلا کے رکھ دیا۔ کسی کو خوشی سے اور کسی کو غم سے دادی جان اور تائی جان اپنی اپنی جگہ بدکی تو تھیں لیکن منہ سے اظہار نہ کیا۔
سمانہ بخاری چپ چاپ سر جھکا گئیں جب کہ ہاشم بخاری کو بیٹے کی شادی نے الرٹ کر دیا' آغا جان اور قاسم بخاری تو پہلے ہی خوش تھے جبکہ ینگ پارٹی کے تو پیر ہی زمین پہ نہ پڑ رہے تھے۔
ڈاکٹر طلحہ بخاری کو خبر ہوئی تو چیخ کر رہ گئے۔ اپنے باپ کے سامنے تو خاموش رہے مگر آغا جان کے سامنے چپ رہنا خود اپنے پیروں پہ کلہاڑی مارنا تھا' اس لیے رات وہ ان کے کمرے میں چلے گئے۔
"آغا جان' ابھی نہیں۔ ابھی میں اس کے لیے تیار نہیں ہوں۔"
"خود کو تیار کرو بیٹا۔" انہوں نے نرمی' محبت سے اسے سمجھانا چاہا۔
"نہیں تیار کر سکتا میں خود کو اتنی جلدی۔"
"طلحہ پھر بھی تو سباس نے ہی تمہاری زندگی میں آنا ہے۔"
"آغا جان آپ مجھے سمجھ نہیں پا رہے۔ میں ایسا کچھ نہیں کر رہا جس سے آپ کو کوئی تکلیف ہو' میں فی الحال کچھ وقت مانگ رہا ہوں' خود کو سمجھانے کا' اس راہ پہ لانے کا آغا جان پلیز آپ مجھے سمجھیں۔ مجھے تھوڑا سا وقت چاہیے..... بس تھوڑا سا۔"
اس نے ان کے کندھوں پہ ہاتھ رکھ کے التجا کی تو وہ گہری سانس لے کر سر جھکا گئے۔ جبکہ وہ بھی ہونٹ کاٹنے لگا۔ باہر سے آتی سباس دروازہ کھولتے ہی گم سم سی ہو گئی تھی۔ وہ لاپروا ضرور تھی مگر حقیقت پسند بھی تھی' اور اس حقیقت پسندی نے اسے ہمیشہ ہی تکلیف دی تھی۔ اب بھی وہ تکلیف میں تھی۔

کیوں؟وہ نہیں جانتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"امی پلیز آج میرے لیے بریانی اور ہریسہ بنائیے گا۔" وہ گود میں کتاب رکھے شیلف کاؤنٹر پہ چڑھ کر بیٹھی امی اور تائی امی کو کام کرتا دیکھ رہی تھی۔اس کی فرمائش پہ اس کی ماں نے اسے نہمائشی جب کہ تائی امی نے مسکراتی نظروں سے دیکھا۔

"بیٹا آج تو کھانا طلحہ اور اماں کی پسند کا بن رہا ہے اور تم تو جانتی ہو اماں کو بریانی سے کتنی چڑ ہے۔" تائی امی نے سہولت سے اسے "تتووے" کا اشارہ دیا۔

"لیکن تائی امی مجھے بریانی کھانی ہے' پھر میں کیسے دوسرا کھانا کھاؤں گی۔" وہ بے زار ہوئی۔

"کوئی بات نہیں بیٹا کل تمہاری پسند کا کھانا بنالیں گے۔" تائی امی نے اسے پچکارا جبکہ اس کی ماں خاموشی سے ہنڈیا میں چمچہ ہلاتی رہیں۔

"اوں۔ہوں تائی امی کبھی نہیں' میں نے جب بھی کسی بھی چیز کی فرمائش کی ہے وہ کبھی نہیں پوری ہوئی۔"

"دل چھوٹا مت کرو جان۔میں تمہاری یہ فرمائش پوری کروں گی۔"

"تائی امی۔ آپ بھی میری امی کی طرح مجھے بہت خواب دکھاتی ہیں۔"

"بہت پاگل ہو تم سباس بیٹا مائیں بچوں کو خواب نہیں دکھاتیں' حقیقت بتاتی ہیں۔" انہوں نے نرمی سے اس کے گال کو چھوا۔

"کاش مجھے حقیقت بتانے والا کوئی نہ ہوتا۔" وہ جمپ لگا کر نیچے اتری۔اس کی ماں نے اسے پر شکوہ نظروں سے دیکھا۔وہ نگاہیں چرا کر باہر نکل گئی۔باہر نکلتے ہی اس کی نظر ٹی وی کے سامنے بیٹھے طلحہ بخاری پہ پڑی تھی۔ٹی وی آف تھا وہ پھر بھی اسے گھور رہا تھا۔اس کے دیکھنے پہ اس نے بھی ایک پل کے لیے اسے دیکھا' آنکھوں اور ماتھے پہ شکن تھی' وہ سر جھکا کر گزر گئی۔

کھانے کے وقت باہر آنے کا اس کا بالکل موڈ نہیں تھا۔اسے بھوک تو لگی تھی مگر کھانا ہمیشہ کی طرح اس کی پسند کا نہیں تھا۔پسند تو اسے ہر چیز ہی تھی مگر کبھی کبھار وہ اپنی خاص پسند بھی چاہتی تھی۔ مگر یہ خواہش کبھی پوری نہ ہو سکی۔اسی کا تو اسے قلق تھا۔اب بھی سخت بھوک کی وجہ سے اس کی جان نکل رہی تھی' پڑھنے میں ذرا دل نہیں لگ رہا تھا لیکن پھر بھی وہ اندر دبکی بیٹھی تھی۔وہ تو زویا آئی اور اسے کھینچ کر باہر لے گئی وہ ڈائننگ ٹیبل پہ آئی تو سب ہی کھانا شروع کر چکے تھے۔وہ چیئر کھینچ کر چپ چاپ بیٹھ گئی۔ماں کے کھنکارنے پر دل کڑا کر سامنے پڑے ڈونگے کا ڈھکن اٹھایا تو اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

دائیں بائیں پڑے ڈونگے دیکھے (جو بریانی سے بھرے ہوئے تھے) اس کا دل باغ باغ ہو گیا۔اس نے بہت بے صبری سے اپنی پلیٹ میں ہریسہ نکالا۔

"تائی امی شکریہ...." اس نے منہ میں نوالہ رکھتے ہوئے جوش سے تائی امی کے کان میں سرگوشی کی۔

"طلحہ نے بریانی اور ہریسہ کی بھی فرمائش کر دی تھی۔" تائی امی نے مسکراتے ہوئے اسے بتایا تو اس کے گلے میں پھنسا نوالہ وہیں اٹک کر رہ گیا۔اس نے بہت نامحسوس طریقے سے کھانا وہیں چھوڑ دیا' بریانی کو وہ چکھ بھی نہ سکی۔

☼ ☼ ☼

اس کا ہسٹری کا پیپر تھا۔رات دیر تک پڑھنے کی وجہ سے وہ صبح چاہ کر بھی جلدی اٹھ نہ سکی۔اس کی امی نے اسے دو تین بار جگایا بھی مگر اس کی نیند سے بوجھل آنکھیں کھلنے میں ناکام رہیں۔چونکہ صبح کا ناشتا اس کی ماں ہی تیار کرتی تھیں اس لیے دوبارہ اس کی طرف آ نہ سکیں۔اور وہ پڑی سوتی رہی لیکن جب کلاک پہ نظر پڑی تو اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔وہ گڑبڑا کر جاگی تھی۔جلدی جلدی تیار ہوئیں۔باہر نکلتے ہی اسے خبر

ہوئی کہ وین جا چکی ہے۔ اس کی امی اسے برا بھلا کہنے لگیں تو وہ روہانسی ہو گئی۔

غنی، عالی اور علی بھی جا چکے تھے، آغا جان کل سے گھر پہ نہیں تھے، ہاشم اور قاسم بخاری بھی اپنی اپنی گاڑیاں لے کر آفسز جا چکے تھے۔

"اب کیا کروں میں۔" روہانسی ہو کر اس نے اپنی ماں کو دیکھا تو وہ بھی پریشان ہو گئیں اس سے پہلے کہ اسے کوئی جواب دیتیں ڈاکٹر طلحہ بخاری نک سک سے تیار ہوا اپنے کمرے سے نکلتا نظر آیا۔ سمانہ بخاری تیزی سے اس کی طرف بڑھی تھیں۔

"چھوٹی امی میں تو بہت جلدی میں ہوں بہت اہم کیس آیا ہے میرا جلد پہنچنا بہت ضروری ہے۔" اس نے تیزی سے انکار کیا تھا۔ سمانہ بخاری چپ سی ہو گئیں "طلحہ بیٹا ٹھہرو۔ ندا کالج سے لیٹ ہو گئی ہے جاتے ہوئے اسے ساتھ لے جانا آج اس کا ہسٹری کا پرچہ ہے۔" دوسرے کمرے سے تیزی سے تائی امی نکلی تھیں۔

"ندا ابھی۔ یہ سب پر لیٹ ہونے کا کون سا خبط چھایا ہے۔" وہ جھنجھلایا۔

"رات سے اسے بخار ہے جانتے تو ہو تائی جان" تیزی سے دوبارہ سے اندر گھسیں۔

"اچھا جلدی کریں، میں لیٹ ہو رہا ہوں۔" اس نے رسٹ واچ دیکھی۔ اس کی ماں نے بھی خوش ہو کر مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھی۔

"میں چلتی ہوں امی۔۔۔" اس نے باہر کی جانب قدم بڑھا دیئے۔

"ٹھہرو۔۔۔ سباس۔"

"اللہ حافظ۔"

"سباس بیٹا۔" وہ اس کے پیچھے بھاگیں۔

مگر وہ کچھ بھی سنے بغیر باہر نکل گئی۔ انہوں نے اسے کئی آوازیں دیں مگر وہ بیرونی گیٹ بھی عبور کر گئی۔ ڈاکٹر طلحہ بخاری کھلے دروازے سے اسے باہر نکلتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

ان دنوں کی شادی تو فی الحال رک گئی مگر غنی اور عاصمہ کی تاریخ پکی ہو گئی جیسے ہی غنی کے ایگزامز ختم ہوئے تھے، چار دن بعد کی تاریخ رکھ دی گئی۔

تاریخ طے ہوتے ہی گھر بار میں چھوٹے بڑوں میں پھرپری سی دوڑ گئی، ہر کوئی نئے نئے کاموں میں مشغول ہو گیا، عورتیں بازاروں کے چکر لگانے لگیں۔

مہندی کا دن آیا تو گھر میں بھگدڑ مچ گئی۔ قریب اور دور کے سارے رشتہ دار مہندی سے پہلے ہی آ گئے تھے۔ لڑکیوں نے کچن سنبھالا تو لڑکے باہر کا انتظام اپنے کندھوں پہ لے کام کرنے لگے۔

ایسے میں کسی کو یاد ہی نہ رہا کہ مہندی کے سارے ڈریسز تو ٹیلرز کے پاس ہی ہیں اور جب عصر کے بعد ندا کو یاد آیا تھا تو لڑکیوں کی چیخیں نکل گئیں۔

"ہائے اللہ۔ اب کیا ہو گا؟" سب کو ایک ہی فکر تھی۔ ہر ایک کے چہرے پہ ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"جاؤ کسی کو بلا لاؤ، ورنہ رونا پڑ جائے گا۔"

"ہائے کس کو ڈھونڈیں ۔۔۔؟" سب روہانسی ہوئیں، پھر سباس نے ہمت کی مردانے میں چلی گئی اور عالی کو کھینچ کھانچ کر لے آئی۔ وہ بھی آسانی سے ماننے والا نہیں تھا سو سو منتیں کرائیں، سب سے سو سو روپے کی رشوت بٹوری اور پھر کہیں جا کر بائیک نکالی اور بازار گیا۔ مگر شام تک اس کی واپسی ہی نہ ہوئی۔

"بدتمیز کہیں کا۔ نہ جانے کہاں جا کے بیٹھ گیا ہے۔" زویا بار بار دروازے میں جا کر اسے دیکھتی اور اسے کہیں نہ پا کر چراغ پا ہو جاتی۔

"شکر کرو دوپٹے پہلے ہی سے تیار کر لیے ورنہ ان کے لیے بھی رونا پڑتا۔" سباس ان سب کے لیے چائے بنا کر لے آئی سب ہی تشکر سے اسے دیکھنے لگیں۔

"میں ذرا مہمانوں کو بھی چائے دے آؤں، تب تک تم ندا اس خبیث کو فون کھڑکاؤ بیٹھ گیا ہو گا کہیں ہوٹل شوٹل میں، اور مبشرا میرے ساتھ چلو، سب کو

چائے دے دیں۔" چائے پینے کے بعد وہ اور مبشرا مہمانوں کو چائے دینے چلی گئیں تو زویا بائیک کی آواز پر باہر بھاگی۔ اللہ اللہ کر کے عالی صاحب جھومتے جھامتے پہنچ ہی آئے۔

"جلدی پہنچ خبیث... مہمان تیار بھی ہونا شروع ہو گئے ہیں اور ہم ہیں کہ ابھی تک سوکھا منہ لیے بیٹھی ہیں۔" زویا نے فوراً" اس کے ہاتھ سے کپڑوں کا بیگ جھپٹا تھا اور پھر اندر کی طرف دوڑ پڑی۔

"آگیا عالی؟" کچھ ہی دیر بعد سباس اور مبشرا اندر آئیں تو ان دونوں کو سنجیدہ سی شکل بنائے بیٹھا دیکھ کر پریشان سی ہو گئیں۔

"ہاں آگیا۔" زویا کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔

"تو پھر اس میں پریشانی والی کون سی بات ہے۔" سباس آگے بڑھ کر کپڑے دیکھنے لگی۔

"تمہارے کپڑے ان کپڑوں' میں نہیں ہیں" ندا کی کمزور سی آواز نکلی۔

"کیا؟" وہ اچھل ہی تو پڑی۔

"شاید وہ ٹیلر کے پاس ہی رہ گئے ہیں۔"

"او۔ تو اب...؟" وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر انہیں دیکھنے لگی۔

"اب تو کوئی بھی لڑکا ٹیلر کے پاس جانے کو تیار نہیں۔"

"عالی کدھر ہے؟" اس نے فکرمندی سے پوچھا۔

"عالی ٹینٹ اور قناتیں وغیرہ لینے چلا گیا ہے۔ جبکہ ڈاکٹر صاحب دیگوں کا انتظام سنبھالے ہوئے ہیں۔ دولہا میاں دوستوں یاروں کے درمیان گھرے بیٹھے ہیں۔ اور علی کو تو صحیح طرح بائیک چلانی آتی ہی نہیں۔" ندا نے سب لڑکوں کی مصروفیت بتائی۔

"تو اب میں کیا پہنوں گی۔؟" وہ رونے کے قریب ہو گئی۔

"یہی تو ہم سوچ رہے ہیں۔"

"یار کچھ کرو۔ میرے پاس تو مہندی کا ایک جوڑا بھی نہیں ہے۔"

"اب کیا کریں' آغا جان تو اس وقت ہمیں بھی کہیں جانے نہیں دیں گے۔" وہ سب ہی اس کے جوڑے کے لیے فکرمند ہو رہی تھیں۔ وہ پریشان پریشان سی کچھ سوچتی باہر نکل گئی۔ واپس پہ علی اس کے ساتھ تھا۔

"اسے تو بائیک صحیح طرح چلانی نہیں آتی۔"

"آتی ہے یا نہیں یہ بعد میں دیکھا جائے گا۔ فی الحال تو میں خود اس کے ساتھ جا رہی ہوں۔ کسی مہمان کی بائیک مانگی ہے اس نے کوشش کریں گے کہ ایک گھنٹے کے اندر اندر واپس آجائیں۔ تب تک تم کسی کو بتانا نہیں۔" وہ علی کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل گئی'

بائیک اسٹارٹ ہوئی تو وہ علی کے پیچھے بیٹھ گئی۔

"دیکھو علی' احتیاط سے چلانا اور آہستہ آہستہ چلانا' جلدی مت کرنا۔" ندا نے آگے بیٹھے علی کو سمجھانا ضروری سمجھا۔ علی نے اثبات میں گردن ہلا دی مگر برا ہو قسمت کا ابھی بائیک گیٹ سے باہر نکلی بھی نہ تھی کہ دادی جان کا وہاں چھاپہ پڑ گیا۔

"دادی بازار میں کچھ کام تھا۔"

"تو اسے کہاں لے جا رہے ہو؟" انہوں نے گھور کر سباس کو دیکھا۔

"دادی اس کے کپڑے ٹیلر کے پاس رہ گئے ہیں۔ وہ علی کے ساتھ لینے جا رہی ہے۔" ندا نے ڈرتے ڈرتے سچ بتا دینا ہی بہتر سمجھا۔

"یوں کہو نا۔ اس کے کام سے یہ جا رہا ہے۔ وقت دیکھا ہے کیا ہو رہا ہے...؟" انہوں نے ماتھے پہ شکن سجا کر ان تینوں کو گھورا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے اس وقت کہیں بھی جانے کی۔ رکو موٹر سائیکل اور اترو اس پر سے... دن کو خیال نہیں آیا جو اس وقت بازار کو دوڑ رہے ہو۔"

"دادی عالی لینے گیا تھا کپڑے... وہ میرے وہیں چھوڑ آیا۔" سباس روہانسی آواز میں بولی تو وہ اسے گھورنے لگیں۔

"تو کیا ہوا' کوئی دوسرے پہن لو۔"

"دادی میرے پاس مہندی کا کوئی بھی نیا جوڑا نہیں ہے۔"

"نیا پہننا ضروری تو نہیں' کون سا تم نے نیا پہن کر حور پری بن جانا ہے۔ اترو بائیک سے اور اندر چلو۔ ورنہ میں ہاشم کو بلا رہی ہوں۔" انہوں نے اسے دھمکایا۔

"دادی پلیز۔" ندا نے بولنا چاہا۔

"تم خاموش رہو۔ یہ کوئی وقت ہے جواں جہاں لڑکی کے باہر جانے کا۔" انہوں نے ندا کو وہیں ڈپٹ دیا۔

"دادی ہم پندرہ منٹ میں آجائیں گے۔" علی کو سباس کی بنی ہوئی شکل دیکھ کر افسوس ہوا۔

"تم لوگ میری بات سن نہیں رہے' جو میں کہہ رہی ہوں وہ کرو۔ اور اندر دفع ہو۔" دادی نے گھرک کر کہا تو وہ تینوں ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔ اتنے میں ہاشم بخاری کا وہاں سے گزر ہوا تو ان سب کو وہاں دیکھ کر رک گئے۔

"کیا ہے۔ اور یہ تم لوگ کدھر جا رہے ہو؟" انہوں نے چھوٹتے ہی پوچھا اور گھور کر علی اور سباس کو دیکھا۔

"بابا۔"

"یہ مہارانی کے کپڑے درزی کے پاس رہ گئے ہیں' وہ لینے جا رہے ہیں۔" علی سے پہلے ہی دادی جان بول اٹھیں۔

"یہ وقت ہے کہیں جانے کا؟" وہ گرجے۔

"میں بھی تو یہی کہہ رہی ہوں مگر یہ منحوس میری بات سنے تب نا' میں روک رہی ہوں مگر یہ برابر انکار کیے جا رہی ہے۔" انہوں نے سباس کو ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے ہاشم بخاری کو بتایا تو ان کے ماتھے پہ بڑے بڑے بل پڑ گئے۔

"اماں جان جو بے دید' بدلحاظ ہوں' وہ کسی کی نرمی سے کہی بات کبھی نہیں سنتے۔ چلو علی اترو بائیک سے اور چلو مردانے میں۔" انہوں نے اسے سنا کر علی سے کہا تو علی چور نگاہوں سے سباس کو دیکھتا بائیک سے اتر گیا۔

"اب تو بھی اتر جا۔ اب کس خصم کے ساتھ بازار کا چکر لگانا ہے۔" وہ دونوں باپ بیٹا داخلی دروازے کی طرف بڑھے تو دادی اسے سنانے سے نہ چوکیں۔ وہ ہونٹ چبانے لگی۔

"نیا جوڑا نہیں ملا تو کیا ہوا کون سا تیرے گھر والے نے تجھے دیکھنا تھا۔ اور تیرے سامنے حسن کی تعریفیں کر کر کے دم بھرنا تھا۔" دادی نے نخوت سے کہا تو وہ اس طرح ہونٹ چباتی بائیک سے اترتی' ندا سے نظریں ملائے بغیر اوپر جانے لگی۔ ابھی چوتھی سیڑھی پہ ہی قدم رکھا تھا کہ ڈاکٹر طلحہ بخاری سے ٹکرا گئی۔ سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔

آنکھ سے پانی چھلک گیا۔ ڈاکٹر طلحہ نہ جانے کیوں اسے آج کچھ بھی سخت نہ کہہ سکا وہ آنکھوں کا پانی پیچھے دھکیلتی تیزی سے وہاں سے ہٹ گئی۔

☼ ☼ ☼

"سباس تم میرا سوٹ پہن لو۔ میں وہی پہن لوں گی جو پچھلے ماہ ہادیہ کی مہندی پہ پہنا تھا۔" وہ اندر آکر لیٹ گئی۔ ندا اس کے پیچھے آئی اور آتے ہی اس کے سامنے اپنا نیا جوڑا رکھ دیا۔

"چھوڑو یار۔ مجھے نہیں نیا جوڑا پہننا۔" اس نے ہاتھ سے اس کا جوڑا پیچھے کیا۔

"میرے پاس بھی کئی پرانے ہیں میں پہن لوں گی ان میں سے کوئی۔"

"اوں۔ ہوں تم نیا جوڑا پہنو گی اور یہی پہنو گی۔" ندا جانتی تھی کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے بھلا یہ کب ہوا تھا کہ کسی خاص موقع پر سباس نے نیا سوٹ نہ بنوایا ہو اور پرانا پہن لیا ہو۔ وہ تو فنکشن آنے سے پہلے ہی اپنے کپڑوں کی تیاری کرنا شروع کر دیتی تھی کجا کہ پرانے کپڑے پہننا' یہ اس کی سرشت میں شامل نہیں تھا۔

"نہیں ندا اپنا سوٹ تم خود پہنو۔ بہت چاہت سے تم نے نا صرف اسے خریدا ہے بلکہ سلوایا بھی ہے۔ اور

میں صرف اپنی خوشی کے لیے تمہاری یہ چھوٹی سی خوشی نہیں چھین سکتی۔"

"کیسی باتیں کرتی ہوں سباس۔ میں اور تم الگ تھوڑی ہیں۔" ندا کو دکھ ہوا۔

"چھوڑو ندا۔ مجھے تمہارا یہ سوٹ نہیں پہننا' میری طبیعت بہت بوجھل ہو رہی ہے۔ میں ابھی ٹیبلٹ لے کر سو جاؤں گی۔ سر میں بھی بہت درد ہے۔" وہ ہاتھوں کی انگلیوں سے اپنا ماتھا دبانے لگی۔

"اور مہندی۔۔۔"

"میری شرکت اتنی بھی ضروری نہیں۔" اس نے آنکھیں بند کرلیں۔

"لوگ کیا کہیں گے؟"

"کسی کو میری غیر موجودگی سے کوئی فرق نہیں پڑے گا' اتنا تو جانتی ہو۔" اس کا لہجہ عجیب سا ہو گیا۔

"لیکن ہمیں تو پڑے گا۔"

"یہ تمہاری محبت ہے ورنہ یہاں تو سب شکر کریں گے کہ میں منحوس اپنی منحوسیت سمیت غائب ہوں۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

"ایسے مت کہو۔"

"ندا میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوتا ہے' کیوں میں ہی سب کو منحوس لگتی ہو' کیوں سب مجھ سے ہی نفرت کرتے ہیں۔" اس سوال کا جواب اپنے پاس ہوتے ہوئے بھی وہ ندا سے پوچھ رہی تھی۔ جو اسے کچھ بھی بتانے سے قاصر تھی دروازے پہ کھٹکا ہوا تو وہ دونوں ادھر دیکھنے لگیں۔

"ہے گرلز' خوش ہو جاؤ' سباس کے کپڑے آگئے ہیں۔" مبشرا خوشی خوشی اندر داخل ہوئی اور آتے ہی بلند بانگ نعرہ لگایا۔

"کیا؟" وہ دونوں اچھل پڑیں۔

"یہ دیکھو۔" اس نے ہاتھ میں پکڑے کپڑے لہرائے۔

"ارے' یہ کون لے کر آیا۔" سباس خوشی سے چیخ مار کر نیچے اتری تھی۔

"ٹیلر کا کوئی بندہ خود دے کر گیا ہے۔ کسی نے گھر سے انہیں فون کھڑکایا تھا۔"

"کس نے؟"

"ارے چھوڑو۔ ہمیں اس سے کیا لینا دینا' بس جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ سب مہمان باہر کی راہ لے رہے ہیں۔"

"ہائے اللہ میں نے تو ابھی بال بھی رنگنے ہیں۔" سباس کو نئی فکر ہوئی۔

ندا گہری سانس لے کر رہ گئی۔ اسے سباس کی یہی ادائیں اور عادتیں تو پسند تھیں کہ وہ کسی بات کو اتنی دیر سر پہ سوار نہیں رکھتی تھی۔ عجب من موجی قسم کی لڑکی تھی' اور بہت سادہ طبیعت کی مالک تھی۔ ابھی کچھ دیر قبل سر میں درد تھا اور ابھی کپڑے دیکھتے ہی کیسے وہ اڑنچھو ہو گیا وہ سوچ کر مسکرا دی۔

"یا اللہ' اس کی قسمت اچھی کرنا۔" اس نے صدق دل سے دعا کی تھی۔

وہ اس کے تایا کی بیٹی تھی اور اس کی ہم عمر تھی' دونوں میں بہنوں جیسی محبت تھی۔ دونوں میں کوئی سگا رشتہ تو کوئی نہ تھا مگر وہ دونوں سگوں سے بڑھ کر ایک دوسرے کو چاہتی تھیں۔ اور یہ بات دادی جان کے علاوہ تائی اماں کو بھی بہت کھٹکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

شادی بخیر و خوبی انجام پا گئی' جس پہ گھر والے سب ہی خوش اور مطمئن تھے۔

"اچھا ہوتا جو اگر طلحہ اور سباس کا فرض بھی ادا ہو جاتا۔" آغا جان' غنی اور عاصمہ کو خوش دیکھ کر کہتے تو دادی جان منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا کر رہ جاتیں۔

ان چاروں کا رزلٹ آیا تو چاروں ہی اچھے نمبرز سے پاس ہو گئے۔ غنی تو پہلے ہی سے آفس جانے لگا تھا البتہ علی نے رزلٹ آنے کے بعد ہی آفس جوائن کیا۔

وہ اور ندا یونیورسٹی جانے لگیں۔ دادی جان ان کے یونیورسٹی جوائن کرنے کے حق میں تو نہیں تھیں مگر آغا جان کے سامنے کچھ بول نہ سکیں' ویسے بھی انہیں ندا پہ تو کوئی خاص اعتراض نہ تھا اصل وجہ تو سباس کے

لیے تھی' وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ مزید پڑھے۔
"صفت کی کمائی نہیں ہے جو ہم غیروں پہ لٹاتے پھریں۔" آتے جاتے اٹھتے بیٹھتے' وہ سمانہ اور سباس کو سناتیں' سمانہ تو خاموشی سے سن لیتی البتہ اس سے چپ رہنا محال تھا۔
"ہاں دادی سچ کہتی ہیں آپ ... یہ تائی جان کے رشتہ دار بھی روز آن ٹپکتے ہیں۔ بھلا ہم کب تک اپنی کمائی ان پہ لٹاتے رہیں۔" وہ کمال مہارت سے بات کو دوسرا رخ دیتی۔ جس پہ دادی تپ جاتیں
"اے خاموش چلتر لڑکی۔ خبردار جو میرے پچھلوں پہ نظر رکھی تو..." چونکہ کنیز فاطمہ ان کی بھانجی تھی اور اس کے رشتہ دار انہی کے پچھلے تھے اسی لیے سچ پا ہو جاتیں' اور اسے ڈپٹ کر رکھ دیتیں۔
"کمال ہے پہلے خود ہی انہیں کوستی ہیں اور پھر اگر کوئی اور کچھ کہے تو آستینیں چڑھا لیتی ہیں' کیسا زمانہ آ گیا ہے۔" وہ ان سے نظر بچا کر ان کے پاندان پہ ہاتھ صاف کرتی' جھنجلاتی تو دادی کو پتنگے لگ جاتے۔
"اے لڑکی۔ کسی خوش فہمی میں مت رہنا' میں جو کہتی ہوں اس گھر میں بسنے والے "غیروں" کو کہتی ہوں' جنہوں نے اس گھر کو اپنے سگے باپ دادا کی کمائی سمجھ رکھا ہے۔" وہ صاف صاف سناتیں تو وہ سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی انجان بن جاتی۔
"کمال ہے آپ نے کسی غیر کو گھر میں اتنی آسانی سے گھسنے کیسے دیا ۔ کیا تب آپ کا شاطر دماغ اور پتھر نما دل سویا ہوا تھا۔؟" وہ ان کے کندھے دبانے لگتی تو چاہتے ہوئے بھی دادی جان اس کے ہاتھ پرے نہ جھٹکتیں کہ کوئی ان کے پاس اتنا فارغ بیٹھ کر نہ تو باتیں کرتا تھا اور نہ ان کے کندھے وغیرہ دباتا تھا۔
"بہت شاطر ہے تو۔"
"آغا جان کہتے ہیں آپ پہ گئی ہوں۔" وہ اتنے ہی آرام سے کہہ دیتی تو دادی دانت کچکچا کر رہ جاتیں۔ جبکہ وہ ان کے منہ کے بگڑتے زاویے دیکھ کر دل ہی دل میں خوب ہنستی۔ ویسے بھی وہ اپنا کماتی تھی اور اپنی پڑھائی اور کھانے کا خرچا خود ہی اٹھاتی تھی پھر کیوں ان سے دبتی۔

☆ ☆ ☆

آغا جان حج پہ جا رہے تھے تو موقع غنیمت جان کر سمانہ بخاری نے ہاشم بخاری کو بھی حج پہ جانے کے لیے قائل کر لیا۔ ان کے دیکھا دیکھی تائی جان اور تایا نے بھی ویزے کے لیے اپلائی کر دیا۔
"جن کی قبر میں ٹانگیں لٹکی ہیں وہ تو آرام سے بیٹھے ہیں' حالانکہ حج پہ انہیں جانا چاہیے تاکہ رب تعالیٰ ان کے سارے گناہ معاف کرے اور آرام سے ان کی جان بخشی ہو سکے۔ ویسے تو ان کی ہونی نہیں..." وہ اور ندا برآمدے میں بیٹھیں مونگ پھلی سے لطف اندوز ہو رہی تھیں جب سباس نے تخت پہ براجمان دادی کو کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے ہانک لگائی۔ ندا اس کی بات کا مطلب جانتی تھی اسی لیے دادی سے نظر بچا کر اسے آنکھیں دکھائیں' البتہ دادی چوکنا ہو گئیں۔
"میں تو عام سی بات کر رہی ہوں' ورنہ مجھے لوگوں سے کیا لینا دینا۔ اس میں تو لوگوں کی اپنی بھلائی ہے۔ یہی تو عمر ہوتی ہے گناہوں سے معافی مانگنے کی' اچھا نہیں ہے کہ جاتے جاتے اپنی جان بخشی کرا جائیں۔" مونگ پھلی کے بہت سے دانوں کو پھونک سے صاف کیا اور سب منہ میں ڈال لیے۔
"ہاں... خود وہ یہاں سے دور چلے جائیں اور جوان جہاں اولاد کو یہاں آنکھیں مٹکانے کے لیے اکیلا چھوڑ جائیں۔" دادی بھلا کہاں چپ رہ سکتی تھیں فٹ بولیں تو وہ انہیں دیکھنے لگی۔
"دادی نیک کاموں میں ایسی باتوں سے رکاوٹ نہیں ڈالی جاتی' یہ تو اپنے دماغ کی اختراع ہوتی جو دل کو مطمئن کرنے کے لیے گڑھی جاتی ہیں۔
ورنہ اس پاک زمین پہ جانے کے لیے تو لوگ ترستے ہیں اور سچ تو یہ ہے رب کے ہاں سے بلاوا بھی کسی کسی کے لیے آتا ہے۔ جو اسے بہت عزیز و پیارے ہوتے ہیں۔ ہم جیسے کم ظرف لوگ بھلا اس قابل کہاں۔" اس نے دادی پہ صاف چوٹ کی تھی۔

ندا نے بمشکل ہنسی روکی دادی اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھنے لگیں۔ پھر زہر خند لہجے میں بولیں۔

"تیری ماں کو بہت ضرورت ہے پچھلے گناہ بخشوانے کی' شکر کر وہ تو جا رہی ہے۔" انہوں نے ایک ہی وار سے اسے چاروں شانے چت کر دیا' وہ چپ کی چپ رہ گئی یہ تو اسے شام کو پتا چلا کہ آغا جان نے دادی کے ویزے کے لیے بھی اپلائی کیا ہوا ہے۔

"بڑی چھپی رستم ہیں دادی ہمیں نہیں بتایا کہ وہ بھی کوئی نیک کام کرنے لگی ہیں۔" اس نے فوراً" اس بات پہ بصرہ کیا تھا۔ ندا اور مبشر ادل کھول کر ہنسیں۔

حج پہ جانے کے لیے سب ہی تیار تھے مگر بد قسمتی سے آغا جان اور دادی جان کے علاوہ کسی اور کو ویزہ نہ مل سکا۔ کیونکہ باقی سب نے بہت لیٹ اپلائی کیا تھا۔

"جیسے اللہ کی مرضی۔ اس بار نہ سہی چلو اگلی بار سہی۔" یہ حوصلہ دینے والی دادی تھیں۔ سب نے ہی اللہ کی مرضی جان کر صبر کر لیا۔

☆ ☆ ☆

"امی آپ اپنے پیسوں سے مجھے بکرا لا دیں۔" اس پہ وہی پرانا جنون سوار ہوا۔

"کیوں تم نے کیا کرنا ہے بکرا ہے؟" اس کی ماں نے گھور کر اسے دیکھا وہ وارڈ روب صاف کر رہی تھیں۔

"عید تک رکھوں گی' اس کی دیکھ بھال کروں گی اور پھر اس کی قربانی کر دیں گے۔ ہمیشہ کی طرح۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے تمہیں علیحدہ سے بکرا رکھنے کی۔ ہم بڑے کر لیں گے قربانی جب کرنی ہوئی۔۔۔" انہوں نے وارڈ روب میں کپڑے لٹکاتے ہوئے اسے گھرکا تو وہ جذباتی ہوئی۔

"اس کا کیا فائدہ' عید سے ایک دن پہلے گائے اور بکرا لے آئیں گے۔ نہ اسے کھلایا نہ پلایا۔ دوسرے دن قربان کر دیا۔۔۔ کیا فائدہ ایسی قربانی کا۔۔۔"

"قربانی۔۔ قربانی ہوتی ہے اس کا فائدہ اوپر والی ذات دینے والی ہے تم فکر مند نہ ہو۔"

"نہیں امی مجھے بکرا لینا ہے اور ہر صورت میں لینا ہے۔" وہ ضدی پن سے بولی تو وہ اسے گھورنے لگیں۔

"پاگل مت بنو' پچھلی بار بھی تمہارے بکرے نے پورے گھر کو تگنی کا ناچ نچا کے رکھ دیا تھا۔"

"تو اچھا ہے نا مزا آتا ہے' جب بکرا دادی کے تخت پہ چڑھتا ہے۔ ان کے سارے فروٹ کھا جاتا ہے۔ تائی کے پودوں کو ہڑپ کرتا ہے۔ ڈاکٹر طلحہ کے کپڑے گندے کرتا ہے۔" وہ مزے سے بولی۔

"تو تمہاری نظر میں یہ اچھی بات ہے۔" وہ کمر پہ ہاتھ ٹکا کر اسے دیکھنے لگیں۔

"تو اور کیا۔۔۔"

"اور جب تمہاری بے عزتی ہوتی ہے۔"

"یہاں پہلے میری کون سی عزت ہے؟" الٹا اسی نے پوچھا تو سمانہ بخاری افسوس سے اسے دیکھنے لگیں' جب کہ وہ کپڑے ہینگ کرنے لگی۔

اس نے بکرے کے لیے ضد کیا باندھی سمانہ بخاری کو سر درد نے آلیا۔ انہوں نے اسے لاکھ سمجھایا' روکا' منع کیا مگر وہ بھی سباس تھی بھلا اپنی ضد سے کیسے ہٹتی بکرا لے کر ہی چھوڑا۔

"یہ کس کم بخت کا اونٹ یہاں گھس آیا ہے۔" دادی نماز پڑھ کر باہر نکلیں تو بکرے صاحب کو اپنے تخت کے پاس بیٹھ کر مزے سے گھاس کھاتا دیکھ کر انہیں پتنگے لگ گئے۔ انہوں نے آتے ہی اسے یہ سر رسید کیا تھا۔

"دادی آہستہ' بے زبان ہے اسے مارنا گناہ ہے۔۔۔" وہ سرعت سے کچن سے برآمد ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں سوکھی روٹی تھی۔ دادی نے گھور کر اسے دیکھا۔

"کس کا ہے یہ بکرا؟" انہوں نے درشتگی سے پوچھا۔

"دادی میرا ہے۔" وہ بکرے کے پاس بیٹھ کر اسے روٹی کھلانے لگی۔

"تو اس دفعہ پھر لے آئی؟" ان کے ماتھے پہ تیوری چڑھی۔

"ہاں تو اس میں کیا برائی ہے۔"

"دفع کر نکال اسے یہاں سے۔ ہم نے کوئی نہیں یہاں پہ فالتو روٹی رکھی ہوئی کہ تیرے ساتھ اسے بھی کھلاتے پھریں۔"

"بے فکر رہیں' آنے والا اپنا رزق ساتھ لے کر آتا ہے۔" بڑا فلسفہ جھاڑا تھا اس نے' دادی گھور کر اسے دیکھنے لگیں۔

"تیرا سگا پیو دے گیا ہے اس کا رزق۔"

"کیا پتا دے ہی نہ گیا ہو۔" اس نے برا مانے بغیر آرام سے کہا تو دادی کو آگ لگ گئی۔

"ہے ہی تو بے شرم' بے غیرت ہڈ حرام۔۔۔ دوسروں کے ٹکڑوں پہ پل کے بھی ذرا غیرت نہ آئی۔ احسان ماننے کے بجائے الٹا احسان جتاتی ہے۔ سن لے جب تیری ماں اجڑ کے آئی تھی اس کے پیر میں ٹوٹی جوتی بھی نہیں تھی۔"

"ہاں تو امی نے ٹوٹی جوتی لا کر کرنی بھی کیا تھی' آپ کو کون سا اس کی ضرورت تھی۔" وہ اپنے مخصوص نرم مگر اندر سے گرم اور آگ لگا دینے والے لہجے میں بولی تو دادی کا۔۔۔ جی چاہا کہیں سے کوئی چیز اٹھا کر اس کے سر پہ دے ماریں مگر وہ اس سے پہلے ہی بکرے کی رسی پکڑ کر وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"دادی آپ حج پہ جا رہی ہیں گالیاں دینا حرام ہے اور ویسے بھی اب آپ کو گالیاں دینا زیب نہیں دیتا' اللہ اللہ کریں اور اللہ کے حضور جانے کی تیاریاں کریں' ورنہ اس طرح جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔" جاتے جاتے پیچھے مڑ کر دادی کو مخلص مشورے سے نوازا اور چل دی۔ وہ جو پھر بھڑکنے لگی تھیں ایک دم سے زبان دانتوں تلے دبا گئیں سچ ہی تو کہہ رہی تھی وہ۔

اس کا بکرا دیکھ کر سب کو ہی غصہ آیا تھا' ہمیشہ کی طرح سب نے ہی ناک بھوں چڑھائی۔

مگر اسے پروا کس کی تھی' وہ اپنے حال میں مست و مگن بکرے کے ساتھ لگی رہی' ندا نے بھی ہمیشہ کی طرح اسے ٹوکا' ڈانٹا اسے بکرا بیچنے کا مشورہ دیا لیکن وہ اپنی بات پر اڑی رہی۔

"جب یہ یونیورسٹی جائے گی پیچھے سے میں بکرا بیچ دوں گی۔" دادی نے اونچی آواز میں سب کو ہی سنایا تھا۔

"گناہ آپ کو ہی ملے گا' ویسے بھی آپ حج پہ جا رہی ہیں۔" جواباً اس نے انہیں ڈرا کے رکھ دیا تو دوبارہ انہوں نے بیچنے کا سوچا بھی نہیں۔

آغا جان اور دادی کی جیسے ہی سیٹیں کنفرم ہوئیں دعوتوں اور ملنے جلنے والوں کا سلسلہ چل نکلا کوئی رشتہ دار ملنے آ رہا تھا اور کسی سے آغا جان اور دادی ملنے جا رہے تھے۔ وہ تمام دن بہت گہما گہمی اور سرعت سے گزرے اور پھر وہ دن آ گیا جب کل انہوں نے شام پانچ بجے کی فلائیٹ سے جدہ جانا تھا' چونکہ جدہ میں ان کے قریبی رشتہ دار مقیم تھے اسی لیے انہوں نے چند دن ان کے ہاں قیام کرنا تھا اور پھر وہاں سے حج کے لیے نکلنا تھا۔

ان کے جانے کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ اب تو دادی کے لب ہمہ وقت ہی کسی نہ کسی دعا کے ساتھ ہلتے رہتے اور خوش قسمتی سے ان دنوں وہ ان کے عتاب سے بچی ہوئی تھی۔

"وہاں جانے والوں کو کیا خبر کہ ان کی واپسی ہوتی بھی ہے یا نہیں' اسی لیے بہتر ہوتا ہے کہ خلق خدا کے ساتھ جو کیا ہو اس کی معافی تلافی مانگ لی جائے۔ ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔" وہ آتے جاتے خود ہی دادی کو چھیڑتی تو وہ منہ ہی منہ کچھ بڑبڑا کر رہ جاتیں۔ اس دن سب ہی ان کے کمرے میں موجود تھے جب وہ دادی کو چھیڑ بیٹھی۔

"دادی آپ حج کی نیت سے جا رہی ہیں نا تو جاتے سمے میرے جیسے لوگوں سے بھی علیک سلیک کرتی جایئے گا۔" وہ باتوں ہی باتوں میں انہیں بہت بڑی چوٹ لگا گئی جس پہ ینگ پارٹی اپنے ابھرتے قہقہوں کا گلا گھونٹتی نظر آئی جبکہ اس کی ماں نے اسے بہت افسوس سے دیکھا تھا۔

"نہ تیرے ساتھ ہم نے کیا برا کیا ہے۔ جو تو آتے جاتے مجھے سناتی ہے' دو ماہ کی تھی پوتڑوں میں لپٹی تھی

جب تجھے یہاں گھسنے دیا۔ تب سے لے کر آج تک تجھے مفت کا کھلا رہے ہیں کبھی ہاتھ سے نوالہ چھینا نہیں' ورنہ کیا حق ہے تیرا یہاں رہنے کا۔ ساری زندگی کی کھا کر بھی حرام کیا ہے تو نے۔۔۔"

ان کے بھڑکنے پہ وہ ہمیشہ کی طرح ہنس دیتی اس بات کو ٹال دیتی' اندر سے چاہے۔ کٹ جاتی مگر اس بات کی خبر باہر تو کسی کو نہ ہونے دیتی' وہ مسکرا کر ایسا کرنے بھی لگی تھی کہ دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی ہاشم بخاری کی آواز اس کی سماعتوں سے آن ٹکرائی۔

"اماں جان کچھ لوگوں کو شوق ہوتا ہے کھا کر حرام کرنے کا۔ آپ اپنا خون نہ جلائیں کھا کر اسی برتن میں چھید کرنا شریفوں کا کام نہیں۔"

کہہ کر وہ مطمئن سے انداز سے اندر گھس آئے' وہ سرخ چہرہ لیے ہونٹ چبانے لگی۔ جبکہ باقی سب اسے دیکھتے نظریں چرانے لگے۔

☼ ☼ ☼

چونکہ شام کو ان کی فلائیٹ تھی اسی لیے صبح ہی گھر میں بھگدڑ مچ گئی محلے کے سب لوگ صبح ہی صبح آکر ان سے ملنے لگے۔ لڑکیاں چائے پانی کا بندوبست کرتیں ہلکان ہوئی جارہی تھیں۔ اور اوپر سے تمام مرد حضرات گھر پہ موجود ہونے کی وجہ سے اپنے اپنے ناشتے کے لیے چیخ پکار کررہے تھے ڈاکٹر طلحہ نے بھی اس دن ہسپتال سے آف لے لیا مگر وہ ابھی تک اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلا تھا۔

ناشتے کی ٹیبل پہ اس کی غیر موجودگی محسوس کرکے آغا جان نے سباس کو اسے بلانے بھیجا تو وہ برا سا منہ بناتی اسے بلانے چل دی۔

اب کی بار وہ دروازہ ناک کرنا نہیں بھولی تھی۔ اس کے "یس" کہنے پر وہ جیسے ہی اندر وارد ہوئی طلحہ کے ماتھے پہ ان گنت شکنیں بچھ گئیں۔ جنہیں وہ فورا" محسوس کرگئی۔

"آغا جان آپ کو ناشتے کی ٹیبل پہ بلا رہے ہیں۔" اپنی ناگواری چھپاتے ہوئے وہ سرد سے انداز سے کہتی فٹ باہر نکل گئی۔

"نہ جانے اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے کڑوا کریلا۔"

وہ آغا جان کو کوئی جواب دیے بغیر سیدھی کچن میں چلی گئی۔ نہ جانے وہ ناشتا کرنے باہر نکلا تھا بھی یا نہیں۔

البتہ دن کو اسے اس بات کا جواب مل گیا جب وہ سب دوپہر کا کھانا تیار کررہی تھیں وہ کچن میں ہی چلا آیا۔

"ندا میرا ناشتا تیار کرکے میرے کمرے میں پہنچا دو۔" کہہ کر وہ رکا نہیں' باہر نکل گیا۔ چونکہ ندا اسی وقت آٹا گوندھ رہی تھی۔ اس لیے اسے چائے اور پراٹھا بنانے کا کہہ دیا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ناشتا تیار کرنے لگی۔

نا صرف تیار کیا بلکہ اس کے کمرے میں بھی پہنچایا' وہ اس وقت باتھ لینے کے لیے گلے میں تولیہ ڈالے باتھ روم میں گھس رہا تھا کہ اسے دیکھ کر رک گیا۔

"تمہیں کس نے کہا کہ ناشتا لاؤ۔"

"آپ کی ہمشیرہ صاحبہ نے ورنہ مجھے ایسا کوئی شوق نہیں ہے کہ نک چڑے اور مغرور لوگوں کے لیے جان جوکھوں میں ڈالوں۔" ٹرے ٹیبل پر پٹخ کر وہ جیسے آئی تھی ویسے ہی باہر نکل گئی مگر اسے ایک بار پھر اندر آنا پڑا جب کچھ ہی دیر بعد ڈاکٹر صاحب کا اس کے نام حکم نامہ جاری ہوا تھا۔

"کیوں' کیوں بلایا ہے اس نے؟" کباب تلتے ہوئے اس نے مبشرا کو گھور کر دیکھا تو اس نے ہاتھ اٹھا دیے کہ "مجھے کیا پتا" نہ چاہتے ہوئے بھی وہ چولہا بند کرکے اس کے کمرے میں چلی آئی آتے ہوئے وہ برے موڈ میں آئی تھی۔

چہرے کو سپاٹ کیے ہوئے آنکھوں میں ناگواری اور پیشانی پہ بل سجائے مگر اندر گھستے ہی اسے یہ ساری ادائیں ڈاکٹر صاحب کے چہرے پر نظر آئیں' البتہ اس کے ہوش اڑ گئے تھے۔ کیونکہ اس کا "لاڈلا" سامنے ہی اپنے کیچڑ میں لتھڑے پاؤں لیے۔ نرم گداز کارپٹ پہ چڑھا اونچی ٹیبل پہ پڑے برتنوں کو چاٹتا یہاں کا مالک لگ رہا تھا۔ جو بڑے مطمئن سے انداز میں ناشتا کررہا

تھا۔

"وہ۔۔۔وہ یہ یہاں۔۔۔" اس کی تو گویا بولتی بند ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے جو گھور کر اسے دیکھا تو وہ بکرے کو وہیں مشغول چھوڑ کر کھلے دروازے سے باہر بھاگ گئی۔

☼ ☼ ☼

فلائٹ کو ابھی تین گھنٹے باقی تھے۔ اسی لیے تمام گھر والے اطمینان سے بیٹھے تھے مگر ان کا یہ اطمینان اس وقت اڑنچھو ہو گیا جب وہ سب بڑے ہال میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ دادی نہ جانے کس کام سے اوپر گئی تھیں، چائے کے بلاوے پہ نیچے اتر رہی تھیں کہ سیڑھیوں سے ان کا پاؤں پھسل گیا۔ وہ اوپر والی دوسری سیڑھی سے گری تھیں اسی لیے نیچے پہنچنے تک وہ بے ہوش ہو چکی تھیں، انہیں فوراً" ہسپتال پہنچایا گیا کیونکہ منہ اور سر سے خون نکل رہا تھا۔ سر سے بہت خون بہہ رہا تھا۔ جب خون رکا تو کاریڈور میں موجود تمام گھر والوں کو خبر پہنچی کہ ان کی ٹانگ دو جگہ سے ٹوٹ چکی ہے، سب گھر والے پریشان ہو گئے کیونکہ اب وہ سفر نہیں کر سکتی تھیں۔

"یہ مبارک سفر ان کی قسمت میں ہی نہیں تھا۔" آغا جان کو بہت افسوس ہو رہا تھا کہ ان کی شریکِ حیات اتنے مبارک سفر میں ان کی شریک سفر نہیں۔

انہوں نے اپنی سیٹ آگے کرانے کا سوچا مگر بچوں نے انہیں ایسا کرنے نہیں دیا سو مجبوراً" انہیں اکیلے ہی یہ سفر طے کرنا پڑا۔

☼ ☼ ☼

دادی جان کو تین دن کے بعد گھر لایا گیا تو ایک بار پھر ان کی عیادت کے لیے آنے والوں لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔

"ایک تو ان لوگوں کو بھی نہ جانے کیا بڑی ہے بات ادا ہوتی نہیں یہ پہلے ہی سے آنے کے لیے لنگوٹی کس لیتے ہیں۔" اسے یونیورسٹی سے مسلسل تیسری چھٹی کرنی پڑی تو اسے تاؤ آ گیا۔

"بری بات سباس مہمانوں کے بارے میں ایسا نہیں کہتے۔۔۔" اس کی ماں نے اسے ٹوکا تھا جس پہ وہ برا سا منہ بنا کر رہ گئی۔ پھر بکرے کو پانی پلانے کے لیے برتن اٹھا کر باہر نکل گئی۔

"بے چاری دادی بہت خاموش رہنے لگی ہیں، تمہیں نہیں لگتا کہ ان کی زبان کو زنگ لگ جائے گا۔" بکرے کے آگے پانی رکھ کر وہ عاصمہ کے پاس چلی آئی جو اپنی شادی کی تصویریں لیے دادی کے تخت کے دائیں جانب پڑی کرسی پہ بیٹھی تھی، اس کی بات پہ عاصمہ کی ہنسی چھوٹ گئی جب کہ سفید دوپٹے، کو منہ پہ ڈالے لیٹی دادی کے کان کھڑک گئے فوراً" پلو پیچھے کیا اور اسے گھورنے لگیں۔

"کیا کہا ہے تم نے؟"

"دادی میں کہہ رہی ہوں۔ کتنے دن ہو گئے ہیں آپ پہلے کی طرح نہیں چہکیں، قسم سے گھر سنسان لگنے لگا ہے آپ کی آواز کے بغیر۔" اس نے فوراً" بات بنائی تو دادی مشکوک سا ہو کر اسے دیکھنے لگیں۔ انہیں قطعی یقین نہیں آیا تھا کہ وہ سچ بول رہی ہے۔ جبکہ وہ اپنی ہنسی روکتی بڑے گیٹ کی طرف دیکھنے لگی جہاں سے ڈاکٹر طلحہ بخاری کی گاڑی اندر آ رہی تھی۔

"ڈاکٹر صاحب اور اس وقت۔" وہ بڑبڑائی اور عاصمہ کے ہاتھ سے تصویریں لے کر دیکھنے لگی۔ طلحہ گاڑی سے اتر کر سیدھا اندر چلا گیا۔ وہ کچھ دیر تک وہیں بیٹھی تصویریں دیکھتی رہی۔ عاصمہ کے سیل پر غنی کی کال آئی تو وہ شرماتی لجاتی وہاں سے اٹھ گئی۔ وہ بھی وہاں اکیلے بیٹھ کر کیا کرتی سب تصویریں سمیٹ کر اندر چلی آئی۔

"چھوٹی امی اس شخص کے ارادے نیک نہیں ہیں، میرے انکار کے باوجود وہ ضدی ہو رہا تھا۔" وہ اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی جب ڈاکٹر طلحہ کی دبی دبی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔ وہ بے دھیانی میں وہاں سے گزر جاتی ادھر کوئی توجہ نہ دیتی مگر اس کے اٹھتے قدم تب رک گئے جب طلحہ نے اس کا نام لیا۔

"وہ کہہ رہا تھا میں سباس سے خود ملوں گا۔" وہ

ٹھٹک کر وہیں رکی اور متجسس سی ہو کر تھوڑا پیچھے آئی اور اپنے کان کچن سے آتی آوازوں کی طرف لگا دیئے۔

"میرے خیال میں تو وہ شخص آج یا کل یہاں ضرور آئے گا۔"

"نہیں طلحہ بیٹا پلیز۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔" اس کی ماں کی آواز میں عجب طرح کا خوف چھلکا تھا۔

"سباس پلیز ادھر آؤ' میری کچھ ہیلپ کرو۔" وہ اندر سے آتی آوازوں کو ——— سمجھ نہ پا رہی تھی' ابھی تھوڑا سا اور آگے بڑھ کر مزید کچھ سننا چاہتی تھی کہ اسے پیچھے سے عاصمہ نے آواز دے لی' وہ فوراً" سیدھی ہوئی۔

"غنی کے کسی دوست کے ہاں نائٹ پارٹی ہے' مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا کہ میں کون سا ڈریس منتخب کروں۔ پلیز تم میری کچھ مدد کردو۔" عاصمہ اس کا ہاتھ پکڑ کر لجاجت سے ——— کہہ رہی تھی۔ وہ الجھی الجھی سوچ لیے اس کے ساتھ ہولی۔ وہ کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ وہ شخص کون ہے' جس کے ارادے نیک نہیں اور ضدی ہو رہا ہے اور اس سے ملنا چاہتا ہے۔ وہ سارا وقت اسی بات کو سوچتی رہی' وہ اپنی ماں سے اس بارے میں پوچھنا چاہتی تھی لیکن اس وقت جو خوف ان کی آواز سے اسے سنائی دیا تھا' اس نے اسے پوچھنے نہ دیا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اپنی ماں سے اس بارے میں فی الحال کچھ پوچھ نہ سکی۔

☼ ☼ ☼

وہ پچھلے صحن میں بیٹھی بہت افسردہ لگ رہی تھی' ساتھ ہی اس کے پیروں میں اس کا لاڈلا شہزادہ بیٹھا گھاس کھا رہا تھا۔ جو کچھ دیر پہلے وہ مرزا صاحب کے باغ سے کاٹ کر لائی تھی۔ اس نے رخ موڑ کر پھولے منہ سے اپنے لاڈلے کو دیکھا اور پھر اس کے مہندی سے رنگے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

"کتنا سمجھا کے گئی تھی کہ کسی چیز کو مت چھیڑنا لیکن تو پھر بھی باز نہیں آیا' سارے گھر والوں کے سامنے بے عزتی کرادی نا میری ——" وہ اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتی بہت دکھی لگ رہی تھی' لاڈلے نے سر اٹھا کر ایک بار اسے دیکھا اور پھر سے گھاس کی طرف متوجہ ہو گیا وہ افسوس بھری سانس لے کر رہ گئی۔

بات اتنی بڑی ہوئی تو نہیں تھی جتنی تائی نے بڑھا دی تھی۔ وہ مرزا صاحب کے باغ سے گھاس کاٹنے جا رہی تھی کہ بکرے کو سکھ چین کے نیچے چھاؤں میں باندھ گئی بکرے نے نہ جانے کب اور کیسے وہاں سے رسی تڑوالی اور کیاریوں میں لگائے گئے نئے پودوں کو نا صرف کھا لیا بلکہ رہے سہے پودوں کو جڑوں سے بھی اکھاڑ دیا۔

وہ جب واپس لوٹی تو تائی کو غم و غصے کی تصویر بنا پایا وہ نہیں جانتی تھی کہ ان کے ساتھ مسئلہ کیا ہوا ہے' اسی لیے ان سے پوچھنے کی سنگین غلطی کر بیٹھی پھر وہ جو شروع ہوئیں اور ان کا ساتھ دادی نے بھی دیا تو مجبوراً" اسے گھاس سمیت اندر بھاگنا پڑا۔

کیونکہ جہاں بیٹھ کر تائی اور دادی اس کی شان میں قصیدے پڑھ رہی تھیں۔ وہیں ایک جانب ڈاکٹر طلحہ کرسی ڈالے اخبار پڑھتا دھوپ سینک رہا تھا۔ اور جو جو قصیدہ آرائی اس کی شان میں ہو رہی تھی۔ وہ اس قابل نہیں تھی کہ وہ ڈھیٹوں کی طرح وہاں بیٹھ کر سنی جا سکتی۔ اسی لیے وہ اندر بھاگی تھی مگر یہ بھاگنا اس کے کسی کام نہ آیا کیونکہ اگلے ہی پل طلحہ اس کے سر تھا۔

"بکرا سنبھال نہیں سکتی تھیں تو اسے لائی کیوں؟" چھوٹتے ہی اس سے پوچھا تو جواباً" وہ گڑبڑا گئی۔

"میں ۔ سنبھالتی تو ہوں۔"

"سباس اب تم بچی نہیں رہی ہو۔ ایسے شوق بچپن میں ہی اچھے لگتے ہیں' اس عمر میں ایسی حرکتیں اور شوق پالنا حماقت کے سوا اور کچھ نہیں' اگر چھوٹی امی تمہیں کچھ کہتی نہیں تو ان کی نرمی کا ناجائز فائدہ مت اٹھایا کرو' تمہیں اس بات کا احساس نہیں ہو تا کہ تم اپنے ساتھ اور لوگوں کو بھی کتنی ٹینشن دیتی ہو۔" وہ سخت غصے میں لگ رہا تھا۔ وہ بھی تو اس کے بکرے سے سخت تپا ہوا تھا۔

"غلط" میں کسی کو کوئی ٹینشن نہیں دیتی بلکہ سب مل کر مجھے ٹینشن دیتے ہیں' پریشان کرتے ہیں اور ستاتے ہیں' میں بھلا کیوں کسی کو .دوں گی۔" اسے اپنی یاد آئی۔

"یہی تو تمہاری بہت بری عادت ہے کہ تم اپنی غلطی مانتی نہیں ہو۔" اس نے اسے گھورا تھا۔

"جب غلطی کرتی ہی نہیں تو مانوں کیوں۔" اس کا اعتماد آہستہ آہستہ لوٹنے لگا تھا۔

"آگے سے فضول بحث مت کیا کرو' میں تمہیں بس یہی کہنے آیا ہوں کہ اگر اسے سنبھال سکتی ہو تو مجھے بتادو' ورنہ کل ہی بکرا منڈی لے جا کر اسے بیچ آؤں گا۔" وہ سختی اور درشتگی سے بولا۔

"بیچ کے تو بتائیں' میں آپ کو نہ وہاں بیچ آؤں۔" کہنا تو چاہتی تھی مگر وہ صرف دو قدموں کے فاصلے پہ کھڑا تھا اور یہ فاصلہ فی الحال غنیمت تھا وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ یہ فاصلہ مٹائے اور اسے گردن سے دبوچ لے۔ اسی لیے وہ اپنی بولتی بند رکھنے پہ مجبور رہی۔

"میں آخری بار تمہیں کہہ رہا ہوں' بعد میں کوئی گلہ نہ کرنا۔ اگر آج کے بعد مجھے اس بکرے کی کوئی شکایت موصول ہوئی تو پھر یہ تمہارے حق میں بہتر نہیں ہوگا سمجھیں۔" انگلی اٹھا کر اسے تنبیہہ کرتے ہوئے وہ جس کروفر سے آیا تھا اسی کروفر سے واپس ہولیا۔ اور وہ اپنا سا منہ لیے کھڑی کی کھڑی رہ گئی اور پھر رہی سہی کسر امی نے نکال دی تھی سب گھر والوں کے سامنے اسے ڈانٹ دیا۔

اسی لیے اب وہ سوجا منہ لیے یہاں بیٹھی تھی۔

"سباس آ کے کھانا کھالو۔ چھوٹی امی بلا رہی ہیں تمہیں۔" ندا نے اسے دور سے آواز دے کر بلایا تھا وہ اہمیت بنی بیٹھی رہی۔ ندا آواز دے کر چلی گئی تھی اس کے بعد اسے کوئی بلانے نہیں آیا وہ بھی ناراضی سے وہیں بیٹھی رہی۔ اٹھی وہاں سے تب جب بکرے صاحب نے سامنے کی بیلوں کو ٹنڈ منڈ کردیا۔ وہ اپنے نیالوں میں اتنی مگن بیٹھی تھی کہ دیکھ بھی نہ سکی بکرا کب اٹھا اور کب یہ کارنامہ سرانجام دے دیا۔

اب اسے خطرہ ہوا کہ کہیں پھر سے نہ ادھر کوئی آجائے اور یہاں کا حشر نشر دیکھ کر باقی کی کسر بھی پوری کردے۔ وہ بکرے کی رسی تھام کر جلدی سے وہاں سے اٹھ گئی۔ وہ بکرے کو پکڑے بڑے ہال سے گزری تو وہاں سب گھر والوں کو بیٹھ کر چائے پیتے پایا۔

"میری غیر موجودگی کسی کے لیے کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتی۔" اس نے دکھی دل سے سوچ کر سب پہ ایک نظر ڈالی تھی۔

"کس کا فون تھا۔۔۔؟" وہ ڈاکٹر طلحہ کے سامنے سے گزر رہی تھی جب ہاشم بخاری نے طلحہ سے پوچھا۔

"کسی کا نہیں۔۔۔"

"تو تم غصہ کس بات پر ہو رہے تھے۔۔۔؟"

"بس ویسے ہی۔ ایک دوست تھا۔۔۔" ڈاکٹر طلحہ نے اس کی ماں کی جانب چور نگاہوں سے دیکھا اس کی ماں کے چہرے کی رنگت اڑی ہوئی تھی۔ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے وہاں سے گزر گئی۔

☼ ☼ ☼

گھر میں تمام ینگ پارٹی نے سیر سپاٹے اور تفریح کا پروگرام بنایا تو اس پروگرام میں ڈاکٹر طلحہ بخاری کو بھی زبردستی شامل کرلیا' جس پہ پہلے تو وہ خاصا جھنجلایا لیکن بعد میں تمام لوگوں کی گرمجوشی دیکھ کر مان گیا۔

"لیکن صرف دو دن کا پروگرام ہونا چاہیے۔۔۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر پہلے ہی سب کو تنبیہہ کردی جس پہ سب نے سر تسلیم خم کردیا۔

"یہ بتاؤ جانا کہاں ہے؟" سب معاملہ طے ہوگیا تو جگہ کی تلاش شروع ہوگئی۔

"مظفر آباد۔۔۔" عنی نے فٹ جگہ ڈھونڈی۔

"دو دن جانے کا فائدہ۔" عاصمہ مایوسی سے بولی۔

"تو پھر سوات چلتے ہیں۔" علی خوشی سے بولا۔

"نہیں چترال۔ دیکھنا کتنا مزا آئے گا۔۔۔" ضویا خوشی سے جھوم اٹھی کیونکہ اسے چترال بہت پسند تھا۔

"وہاں نہیں کوئی قریبی جگہ ڈھونڈو۔" طلحہ نے اس کی خوشی کو ملیامیٹ کیا۔

"مری یا پھر ناران۔۔۔ کاغان۔"

"ارے چھوڑو۔۔۔ دو دن کے لیے جانا ہے تو "فورٹ منرو" چلتے ہیں۔ دل کھول کر انجوائے کرلیں گے۔" یہ تجویز سباس صاحبہ نے دی تھی جو کب سے کتاب پڑھنے میں مشغول تھی۔

"آ۔ شاباش' اپنی ہی طرح کی بے سواری جگہ ڈھونڈنا۔" عالی نے اس کی تجویز کو بھی رد کرنا چاہا۔

"بے سواری کیوں اتنی پیاری تو جگہ ہے پہاڑی دیکھی ہے کتنی خوبصورت ہے۔"

"ہاں بالکل تمہارے منہ کی طرح۔" عالی کو شاید وہ جگہ ناپسند تھی۔

"دفع۔ نہیں جانا تو نہ جاؤ۔۔۔ میں وہاں جانے کے لیے کون سا مر رہی ہوں۔" وہ عالی کے سر پہ کتاب مار کر وہاں سے اٹھ گئی باقی سب پروگرام بنانے لگے۔

"سنو۔۔۔" وہ کچن میں کھڑی اپنے لیے چائے بنا رہی تھی جب ضوریا پیچھے سے آدھمکی۔

"کیا ہے؟" اس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"تمہارا کہا امر ہو گیا ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" چائے میں پتی ڈالتے ہوئے اس نے نا سمجھی سے اسے دیکھا۔

"مطلب یہ کہ ڈاکٹر صاحب نے "فورٹ منرو" کے لیے کلنک کا ٹیکہ لگا دیا ہے۔"

"یعنی۔"

"یعنی تمہارے شوہر نامدار نے فورٹ منرو کو ہی ہیر و تفریح کے لیے پہلی اور آخری جگہ قرار دے دیا ہے۔ اسی پہ سب متفق ہو گئے ہیں۔ ویسے ڈاکٹر صاحب ہیں کتنے کیسے آرام سے تمہاری بات مان گئے۔ مجھے تو یقین نہیں آرہا۔" اس کی چائے میں اپنے لیے دودھ ڈالتے ہوئے ضوریا نے کہا تو اس نے کسی بھی قسم کی خوش فہمی میں مبتلا ہوئے بغیر سر جھٹک دیا۔

"بہت قریبی جگہ ہے' اس لیے مانے ہیں وہ۔" اس نے اپنے ساتھ ضوریا کو بھی مطمئن کیا۔

☼ ☼ ☼

اگلے ہی دن وہ سب جوش و خروش سے "فورٹ منرو" کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ چونکہ وہاں ڈاکٹر طلحہ کے کئی دوست مقیم تھے اس لیے انہیں رہائش کا کوئی خاص مسئلہ نہ ہوا۔ گھر سے نکلنے سے پہلے ہی طلحہ نے اپنے دوست سے کہہ کر رہائش کا بہترین انتظام کرالیا اور جب یہ "انتظام" دیکھا گیا تو ان سب کے آنسو نکل آئے۔ سب کا جی چاہا دھاڑیں مار مار کر روئیں۔

ایک تو دوست کا گھر بہت اونچائی پر تھا اور اوپر سے وہ اس حالت میں نہیں تھا کہ وہاں رہا جا سکتا' ہر طرف مٹی' دھول اور گند بکھرا تھا۔

"یہ گھر ہے بھلا۔" سب سے پہلے سباس نے ہی ناک بھوں چڑھائی۔ جس پہ ڈاکٹر نے گھور کر اسے دیکھا۔

"شکر کرو یہ بھی مل گیا ہے' ورنہ یہاں گھر ملنے بہت مشکل ہیں۔" اس نے ڈانٹ کر کہا تو سب ہی کو خموش ہونا پڑا' پھر لڑکیوں نے ہمت کی اور وہاں جھاڑو پونچھا کرنے لگیں (تھکن ہونے کے باوجود) تقریباً" آدھے گھنٹے بعد ہی گھر کی اصل حالت نکل آئی اور وہ چمکنے لگا۔ اور پھر جب اتنی محنت کے بعد گھر کو دیکھا گیا تو وہ گھر اتنا بھی برا نہ لگا۔ دو کمروں' برآمدے' کچن اور باتھ روم پہ مشتمل اس گھر کا صحن بہت بڑا تھا' اس کی دیواریں بہت چھوٹی تھیں کہ پھلانگ کر باہر جایا جا سکتا تھا۔ اور سامنے دیوار نہیں بلکہ گرل لگی ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے وہیں برآمدے میں بیٹھ کر ہر چیز کا با آسانی جائزہ لیا جا سکتا تھا وہیں برآمدے میں بیٹھ کر ان سب نے کھانا کھایا اور پھر کھانے سے فراغت کے بعد سیر کے لیے نکل کھڑے ہوئے گھر چونکہ بہت اونچائی پر تھا اسی لیے انہیں سیر کے لیے نیچے کی طرف آنا پڑا۔

نیچے آتے ہوئے ان سب کے قہقہے بے ساختہ چھوٹ رہے تھے کیونکہ وہاں کے راستے بہت ٹیڑھے میڑھے اور اونچے نیچے تھے' سب ہی گرتے پڑتے نیچے آرہے تھے' سب کو ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی انہیں پیچھے سے دھکے دے رہا ہے۔ سباس تو کئی بار گرتے گرتے بچی۔

اگلے ہی دن وہ سب جوش و خروش سے "فورٹ

"ہائے اللہ ۔ اور کتنا نیچے اترنا ہے۔" وہ نیچے اترتے ہوئے سب سے زیادہ حواس باختہ ہو رہی تھی۔ سب ہی ہمت کر کے نیچے اتر گئے جبکہ وہ اوپر ہی رہی۔

"کتنے خود غرض لوگ ہیں مجھے اکیلا چھوڑ کر خود پہلے ہی نیچے جا بیٹھے۔" اس نے خود کو اوپر اکیلا پایا تو باقی سب پر اسے غصہ آنے لگا۔ وہ جھاڑیاں پکڑ پکڑ نیچے اتر رہی تھی کہ یکدم اس کا پاؤں پھسل گیا۔ دائیں طرف ایک بہت بڑی کھائی تھی۔ اس کی چیخ نکل گئی۔

"آرام سے۔" کسی نے اسے آگے سے تھاما تھا' وہ ہوا اپنے تمام حواس چھوڑ بیٹھی تھی۔

اس آواز پہ پٹ سے آنکھیں کھول کر اوپر دیکھنے لگی۔ خود کو کسی اجنبی بازوؤں میں دیکھ کر اسے رنٹ لگا تھا' وہ تیزی سے پیچھے ہٹی۔ اس کی آنکھوں میں انتہا درجے کا خوف ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور سانس تھی کہ ٹوٹ ٹوٹ کر آ رہی تھی۔

"آپ اکیلی ہیں؟" تھامنے والے نے پوچھا تھا مگر اس کی بات کا جواب دیے بغیر تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ اب وہ آہستہ آہستہ احتیاط سے چلنے کے بجائے دوڑنے کے انداز میں چل رہی تھی۔ نیچے پہنچتے ہی ملاحہ نے اسے اس کی نازک مزاجی پہ ڈانٹا تھا' جس پہ وہ کچھ کہہ نہ سکی۔

☼ ☼ ☼

دوسری دن انہوں نے "ڈائنما جھیل" جانے کا پروگرام بنایا موسم بہت خوش گوار اور خوبصورت تھا' وہاں شدید سردی ہونے کی وجہ سے ان سب نے جرسیاں اور لانگ کوٹ پہن رکھے تھے' اسے تو ویسے بھی بے حد سردی لگتی تھی۔ اتنے شدید سرد موسم میں تو وہ جتنے بھی سویٹر اور جرسیاں پہنتی وہ کم تھے۔ اب بھی اس نے پہلے ہائی نیک جرسی اس پہ سویٹر اور اس پہ لانگ کوٹ پہن رکھا تھا پھر بھی اس کی سردی کم نہیں ہو رہی تھی۔ ندا اسے سردی سے کانپتے دیکھ کر ہنس دی۔

"قسم سے اتنا کچھ پہن کر بھی کانپتے ہوئے تم بدھو لگ رہی ہو۔" اس نے ہنستے ہوئے اس پہ کمنٹس دیا تھا جس پہ اس نے منہ چڑا دیا۔ جب طلحہ نے اسے دیکھ کر ناک چڑھائی تو اس کا جی چاہا سب کے سر پھاڑ دے۔

"یہ سب کم ہیں' تم خود پہ ایک کمبل اور ایک رضائی لپیٹ تو اچھا تھا۔" اس نے اس پہ طنز کیا تو اس کا منہ بن گیا۔ اس لیے وہ غصے سے وہاں سے ہٹ گئی۔

وہ سب اس وقت "ڈائنما جھیل" کی سیر کو نکلے تھے۔ سب اس تو اتنی خوبصورت جھیل دیکھ کر مبہوت رہ گئی تھی کچھ ایسی ہی کیفیت باقی سب کی بھی تھی۔

"یا اللہ۔ کتنی خوبصورتی ہے یہاں۔" اس نے اکیلے چلتے ہوئے دائیں بائیں نظر ڈال کر بے اختیار اللہ کی خوبصورت صناعی کی تعریف کی تھی۔

جھیل کے ارد گرد خوبصورت سی گرل لگی ہوئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ گرل کے ساتھ چلنے لگی' تب ہی یکدم اسے کچھ احساس ہوا' وہ رک گئی' گردن موڑ کر پیچھے دیکھا تو پیچھے آنے والا شخص مسکرا دیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک پل کے لیے شناسائی ابھری جو اس نے فوراً چھپا لی اور پھر سے سامنے منہ کر کے چلنے لگی۔

"یہاں سیر کرنے کے لیے' آپ اکیلی آئی ہیں؟" پیچھے چلنے والا بڑی بے تکلفی سے اس کے ساتھ ہو لیا۔ اس نے گردن موڑ کر ناگواری سے اسے دیکھا تو وہ اتنی ہی بے تکلفی سے مسکرانے لگا۔

"اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ کل بھی آپ اکیلی تھیں اور آج بھی اکیلی ہیں آں۔ ہاں میں بھی کتنا احمق ہوں۔" بات کرتے کرتے اس شخص نے بے اختیار اپنے سر پہ ایک ہاتھ مارا۔

"یہ ہی نہیں سمجھ پا رہا کہ اگر آپ اکیلی ہیں تو یقیناً یہیں کی رہائشی ہوں گی۔ ہے نا؟" اس شخص کے اندازے پر وہ کچھ نہیں بولی یونہی آہستہ آہستہ چلتی رہی۔ اسے بھی شاید جواب نہیں چاہیے تھا۔ اسی لیے پھر سے شروع ہو گیا۔

"بہت خوبصورت ہے یہ جگہ' میں یہاں ہر سال آتا ہوں خاص کر گرمیوں میں' مجھے یہ جگہ بے حد پسند ہے خاص کر اس کی مشہور جگہ "پیالہ" آپ نے تو "پیالہ" دیکھا ہوگا؟" ایک بار پھر اس کی طرف صرف سوالیہ نگاہیں کی گئیں۔ جواب شاید چاہیے نہیں تھا اسی لیے بغیر اصرار کیے۔ لانگ کوٹ میں ہاتھ پھنسا کر اسی رفتار سے چلتا رہا جس رفتار سے وہ چل رہی تھی۔

"میں تو اس جگہ کا دیوانہ ہوں قسم سے جب پہاڑ سے پانی ٹپک ٹپک کر پیالے میں گرتا ہے' تو میرا دل قطرے قطرے کے ساتھ ہمکتا ہے۔ میں تو یہ منظر چار چار گھنٹے بیٹھ کر دیکھتا رہتا ہوں۔ دوست مجھے پاگل کہتے ہیں جب میں وہاں بیٹھتا ہوں اور اس منظر میں کھو جاتا ہوں۔"

"یہ سب آپ مجھے کیوں بتا رہے ہیں۔۔۔؟" ایک پل کے لیے رک کر اس نے نا صرف گھورا بلکہ تڑخ کر پوچھا بھی۔ جس پہ اس شخص کے مسکاتے ہونٹ فوراً" بند ہو گئے اور وہ سٹپٹا کے رہ گیا۔

"وہ۔۔۔ تو بس ویسے ہی۔"

"اور آپ میرے ساتھ ساتھ کیوں چل رہے ہیں؟" خاصے جلال میں پوچھا تھا۔ وہ شخص اتنا گھبرا گیا کہ کچھ بول ہی نہ سکا۔

"میں ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں کہ آپ کی بے تکلفی دیکھ کر آپ سے دوستی کرنے کی خواہاں ہو جاؤں۔ جائیے آپ اپنا راستہ ناپیے مجھے غصہ آگیا تو وہ آپ کے حق میں بہتر نہ ہوگا۔" اس نے کمر پہ ہاتھ ٹکا کے جس انداز سے کہا تھا۔ اس نے اس شخص کو سچ مچ دھمکا کے رکھ دیا۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ وہ اسے گھورنے لگی۔ وہ شخص کچھ بول ہی نہ سکا' تو گھورتے گھورتے اس نے سامنے منہ کر لیا اور سر جھٹک کر چل دی۔

"ویسے آپ رہتی کہاں پہ ہیں؟" وہ سمجھی تھی وہ پیچھے چلا گیا ہے مگر وہ ایک بار پھر اس کے کان کے قریب آکر بولا تو وہ اچھل پڑی۔

"کیوں۔۔۔؟" "کیوں" توپ کے گولے کی طرح اس کے منہ سے نکلا تھا۔

"کیونکہ مجھے ایسی ہی کسی لڑکی تلاش تھی آپ اپنا ایڈریس دیں' میں آپ کے گھر آنا چاہتا ہوں۔" نا صرف بے تکلفی بلکہ بڑی اپنائیت بھی تھی لہجے میں۔ سباس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

"بہت ڈھیٹ قسم کے انسان ہیں آپ۔" کچھ دیر بعد اسے ہوش آیا تھا۔

"یہ تو آپ کو اب پتا چلے گا۔" کہہ کر وہ رکا نہیں تیزی سے آگے نکل گیا' وہ اس کی پشت گھورتی رہ گئی۔

"کون تھا یہ؟" ابھی وہ اس شخص کی پشت کو گھور ہی رہی تھی کہ ڈاکٹر طلحہ کی آواز اس کی سماعتوں سے آن ٹکرائی۔

"کون؟" وہ کچھ نہ سمجھی کہ وہ کس کا پوچھ رہا ہے۔

"یہی۔ جو ابھی تمہارے ساتھ تھا۔"

"مجھے کیا پتا' میں کون سا یہاں لوگوں سے ایڈریس لینے کے لیے بیٹھی ہوں۔" وہ برا مان گئی۔

"اجنبی لوگوں سے بے تکلفی اچھی نہیں ہوتی۔" پوشیدہ لفظوں میں وہ اسے بہت کچھ سمجھا گیا۔ اس نے کندھے اچکا دیئے۔

☼ ☼ ☼

وہ وہاں آئے دو دن کے لیے تھے مگر پھر اس پروگرام کو تھوڑا سا بڑھا دیا گیا۔ ڈاکٹر طلحہ بخاری خود ہی پانچ دنوں کے لیے مان گیا۔ اسے۔۔۔ راضی دیکھ کر سب ہی خوشی سے جھوم اٹھے۔ سب نے گھر پہ بات کی تو سب ہی ان کی غیر موجودگی پر پریشان اور افسردہ لگ رہے تھے۔

"امی میرے شہزادے کا خیال رکھیے گا' اسے دال کے پتے نہ چڑھنے دیجیے گا۔" جب اس نے فون پہ بات کی تو سلام۔ دعا سے پہلے ہی اپنے لاڈلے کے بارے میں پوچھا اور اپنی ماں کو اس کا خصوصی خیال رکھنے کو کہا' جواباً" اس کی ماں ہنس دی۔ جب کہ طلحہ اس کی اس "فکر مندی" پہ اسے گھورنے لگا۔

"آپ کا کیا۔۔۔ آپ نے کبھی کسی سے محبت کی ہو

پتا ہوتا کہ کس طرح کسی کا خیال رکھا جاتا ہے۔"
بات کرنے کے بعد اس نے اس کی گھوری کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا۔ اور وہ افسوس سے سر ہلاتا رہ گیا۔

اس دن وہ لوگ "پیالہ" دیکھنے گئے تو وہاں سباس کا ٹاکرا ایک بار پھر اس شخص سے ہو گیا۔

"مجھے یہ منظر ہمیشہ سے بہت پسند رہا ہے لیکن آج لگ رہا ہے۔ جیسے میں یہاں سب کچھ ہار گیا ہوں' سمجھ میں نہیں آرہا کہ اس پیالے کو دیکھوں یا آپ کی..." لفظوں میں اک سحر سا بھر کر وہ بہت محبت سے بولا تھا۔ جس پہ اسے کرنٹ سا لگ گیا اس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ مبہوت سا ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے دل کو کچھ ہو گیا۔ اس نے چور نگاہوں سے فاصلے پہ کھڑے طلحہ کو دیکھا اور پھر اس شخص کو۔

"بہت بے چین رہنے لگا ہوں میں' نہ دن کو سکون ملتا ہے نہ رات کو چین' ان دو دنوں میں میری حالت بہت غیر ہو گئی ہے کہ میں خود کو بھی اجنبی لگنے لگا ہوں' سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں کیا کروں' آپ کے بارے میں کچھ جانتا تک نہیں لیکن پھر بھی آپ کے سامنے دل ہار بیٹھا ہوں پلیز آپ۔"

"سباس چلو آئس کریم کھاتے ہیں۔" ندا نے آواز دی تو وہ شخص مسکرانے لگا۔

"سبا۔۔۔ س۔۔۔" اس نے سرگوشی کے سے انداز سے اس کا نام دہرایا۔ وہ کچھ بھی کہے بغیر ندا کے پاس جانے لگی۔

"شکر ہے اتنا تو پتا چلا۔" وہ بڑبڑا دیا تھا۔ اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا' وہ لانگ کوٹ میں ہاتھ پھنسائے ذرا کندھے اچکا کر مسکرا دیا۔

ان سب نے آئس کریم لی اور ایک جانب لگے درختوں کے جھنڈ میں پڑی کرسیوں پر بیٹھ کر کھانے لگے۔ موسم اتنا خوش گوار ہو رہا تھا کہ وہاں سے اٹھنے کا کسی کا بھی جی نہ چاہا۔ وہیں بیٹھ کر انہوں نے چائے اور سموسے اور پکوڑوں کا آرڈر دے دیا۔ اس کا چائے پینے کو جی نہیں چاہ رہا تھا اس لیے اس نے اپنے لیے مونگ پھلیاں اور چپس منگوا لیے۔

"لگتا ہے میری طرح آپ بھی چائے کو پسند نہیں کرتیں۔" وہ نہ جانے کب سامنے درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر آ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ دائیں بائیں دیکھنے لگا۔

"کتنی خوبصورت جگہ ہے یہ سباس' بالکل تمہارے چہرے کی طرح۔" اس نے آہستہ سے سرگوشی کی تھی۔

"اور یہ جھیل بالکل تمہاری آنکھوں کی طرح۔ کتنی دل کش۔ کتنی گہری۔۔۔" اس نے ایک سائیڈ پہ موجود جھیل پہ ایک پیار بھری نظر ڈالی اور پھر وارفتگی سے اسے دیکھنے لگا۔ سباس کی آنکھوں میں جہاں پہلے ناگواری اتری تھی۔ اب وہاں وحشت سی بھر گئی۔

"بہت بے ہودہ قسم کے انسان ہیں آپ' شرم تو نہیں آتی میرا پیچھا کرتے ہوئے۔" آواز دبا کر وہ غرائی تھی۔ کیونکہ بائیں جانب کرسیوں پر طلحہ سمیت سب ہی بیٹھے چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے بے شک وہ قہقہوں اور خوش گپیوں میں مصروف تھے لیکن کسی کی بھی تو ادھر نظر پڑ سکتی تھی اور وہ اس کے بے ہودہ قسم کے ڈائیلاگز سن سکتا تھا۔

"آپ نے ہی کیا ہے سباس۔۔۔ قسم سے آپ نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ بالکل پاگل کر کے رکھ دیا۔"

"شٹ اپ۔۔۔ شرم آنی چاہیے آپ کو ایسی چیپ حرکات کرتے ہوئے۔" وہ ایک بار پھر غرائی تو وہ شخص بے بسی سے گہری سانس لے کر رہ گیا۔ جبکہ وہ ہونٹ چباتی بہت غیر محسوس طریقے سے چلتی ہوئی طلحہ کے بائیں جانب پڑی چیئر پر آ بیٹھی۔ طلحہ نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

جس دن وہ واپس آنا چاہ رہے تھے اس دن موسم بہت ابر آلود ہو گیا جس کی وجہ سے انہیں ایک دن اور وہیں ٹھہرنا پڑا۔

"اب رک ہی گئے ہیں تو کیوں نہ "فاطمہ جناح پارک" سے ہی ہو آئیں۔" غنی نے کہا تو طلحہ

سمیت سب ہی اس بات پہ متفق ہوگئے۔ چونکہ یہ پارک بہت اونچی پہاڑی پر تھا انہیں وہاں پہنچنے میں بہت وقت لگا۔ وہاں بہت زیادہ ٹھنڈک اور سردی تھی لیکن پھر بھی موسم بہت حسین تھا وہ سب دل سے اس موسم اور جگہ کو انجوائے کرنے لگے۔ وہیں فورٹ اور منو کی قبریں بھی تھیں۔ ان سب نے ان دونوں میاں، بیوی کی قبریں دیکھیں، اور انہیں ڈھیروں دعائیں دیں کہ انہوں نے اتنا خوبصورت دلکش علاقہ دریافت کیا تھا۔ اس پارک کے چاروں طرف بھی گرل لگی ہوئی تھی۔

ان سب نے وہاں پورے پانچ گھنٹے گزارے تھے اور پھر واپسی کی راہ لی۔ وہ سب ساتھ ساتھ چل رہے تھے کہ بارش شروع ہوگئی۔ طلحہ کے کہنے پر سب تیز تیز چلنے لگے اور جلدی جلدی نیچے اترنے کی کوشش کرنے لگے۔ اس لیے سب علیحدہ علیحدہ اور الگ الگ ہوتے چلے گئے۔ شام کے سائے بھی بڑھ رہے تھے اور ان کے پاس کوئی ٹارچ وغیرہ بھی نہیں تھی، اسی لیے طلحہ سب سے پیچھے چلتا اونچا اونچا بولتا سب کو ایک ساتھ چلنے کا کہہ رہا تھا۔ اور وہ سب حواس باختہ ہوئے تیز بارش میں نہاتے جب نیچے گھر میں پہنچے تو ایک ہولناک سانحہ ان کے ساتھ پیش آچکا تھا۔

سباس غائب تھی۔ نہ جانے کہاں رہ گئی تھی وہ۔

☆ ☆ ☆

شام کے گہرے سائے، تیز بارش، اونچی نیچی پگڈنڈیاں اور اوپر سے تیز چلو تیز چلو طلحہ کی غضبناک آواز، سب کے ساتھ ساتھ اس کے ہاتھ پاؤں بھی پھول رہے تھے۔ وہ بھی دوڑنے کے سے انداز میں آگے ہی آگے پھسل رہی تھی پھر نہ جانے کیا ہوا، کب اس کا پیر کسی پتھر سے ٹکرایا اور وہ آگے کو بڑھ گئی گرتے گرتے اس کا سر ایک بڑے درخت سے ٹکرایا تو اس کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔

اس نے نہ جانے چیخ ماری یا نہیں، یہ اسے یاد نہیں تھا۔ اسے یاد تھا تو صرف اتنا کہ اسے چوٹ بہت سخت قسم کی لگی تھی اور وہ آنکھیں موند گئی۔

☆ ☆ ☆

سباس کی گمشدگی نے ان کے ہاتھ پاؤں پھلا کر دیئے۔ لڑکیاں تو باقاعدہ رونے لگی تھیں جس پہ لڑکے اور پریشان ہوگئے ڈانٹ ڈپٹ کے انہیں چپ کرایا اور پھر اسے ڈھونڈنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے اونچی نیچی سب جگہوں پر اسے ڈھونڈا گیا۔ پتھروں، دائیں بائیں جانب اسے تلاش کیا گیا۔ مگر وہ مل کر دی، ان سب کی پریشانی بڑھتی چلی گئی ایک تو بارش اوپر سے رات کا اندھیرا بھی بہت گہرا تھا۔

وہ سب ہی اندر سے خوفزدہ ڈرے ہوئے تھے جانتے تھے کہ اگر وہ کسی کھائی میں گر گئی ہے تو اس لاش بھی ڈھونڈی نہیں جاسکتی۔ وہاں اتنی بڑی بڑی کھائیاں تھیں۔

"اب کیا کریں۔" علی چھوٹا تھا اسی لیے رو دینے تھا۔ طلحہ نے عالی کو اس کے ساتھ لگایا اور واپس دیا۔ خود وہ اور غنی آگے بڑھ گئے۔

اتنی سخت تیز بارش میں بجلی بھی برابر چمک رہا تھی۔ وہی جگہیں جو دن کو بہت خوبصورت اور دل کش لگ رہی تھیں۔ اس اندھیرے میں اتنی ڈراؤنی اور خوفناک لگ رہی تھیں کہ بے اختیار آنکھیں بند کر لینے کو جی چاہ رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں ٹارچیں لیے بہت آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔ ٹارچ کی روشنی بھی اس اندھیرے کو چیرنے کے لیے ناکافی تھی۔ بس اتنا تھا کہ اپنے سے آگے تھوڑی سی جگہ نظر آجاتی تھی۔ وہ دونوں اونچی آواز میں باقاعدہ سباس کو آوازیں بھی دے رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا جب اسے ہوش آیا۔ بارش چونکہ زوروں پر تھی، تیز پانی چہرے اور جسم پر پڑنے کی وجہ سے ہی اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ آنکھیں کھلتے ہی جب اسے اپنے چاروں طرف اندھیرا نظر آیا تو بے اختیار اس کی چیخیں نکلنے لگیں۔

دائیں بائیں لگے چیڑ اور سفیدے کے لمبے لمبے
قامت درخت اندھیرے میں عجب طرح کا خوف
ا کر رہے تھے۔ وہ جس جس درخت کو دیکھ رہی
تی۔ وہ اسے کسی جن اور بھوت سے کم نہیں لگ رہا
ھا اور جب درختوں پہ بجلی چمکتی اور ان کی ڈالیاں اور
ٹانیں عجب طرح کا تاثر پیش کرتیں، جیسے بہت سی
یلیں اسے اپنے دانت دکھا رہی ہوں تو وہ جھرجھری
لے کر آنکھیں بند کرنے کی کوشش کرتی مگر ناکام رہتی
یونکہ ایسا کرنے سے اسے احساس ہوتا کہ کوئی اس
ل طرف آرہا ہے اور اسے بس دبوچنے ہی والا ہے تیز
ارش اور سخت سردی نے اس کے انگ انگ میں
ری سی بھر رکھی تھی۔ وہ خود کو یہاں اکیلا پا کر اور زیادہ
ڈرنا اور زور زور سے رونا چاہتی تھی مگر اندر جو خوف
پھیلا ہوا تھا کہ کوئی ابھی اسے پکڑ لے گا۔ دبوچ لے
گا۔ اس نے اسے ایسا کرنے سے باز رکھا اسی لیے وہ منہ
ہاتھ جما کر اپنی چیخیں روکتی گھٹی گھٹی آواز میں رونے
لگی۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے ساتھ والا درخت
مضبوطی سے تھام رکھا تھا اور اپنا چہرہ بھی تقریباً"
درخت کے اندر گھسایا ہوا تھا۔

اسے روتے روتے نہ جانے کتنا وقت بیت گیا۔
جب اچانک بہت دھیمی آواز اس کے کانوں سے
ٹکرائی۔ اس نے سر نہیں اٹھایا۔ وہیں منہ دبا کر روتی
رہی کہ وہی آواز تھوڑی سی اونچی ہو کر ایک بار پھر
ابھری۔

روتے روتے اسے احساس ہوا جیسے کسی نے اسے
آواز دی ہو۔ اب کی بار روتے روتے اس نے ذرا سا سر
گھما کر دائیں بائیں دیکھا تھا مگر اسے درختوں اور
سرسراتی جھاڑیوں کے سوا اور کچھ نظر نہ آیا۔

"مسباس۔۔۔ جہاں ہو آواز دو۔" بھاری آواز اب کی
بار بہت صاف ہو کر ابھری تھی اور اس کے ساتھ ہی
اس کو سامنے کی پگڈنڈی پر روشنی کی ہلکی سی لکیر نظر
آئی۔ سہم کر وہ درخت کے پیچھے ہولی، اس کا تنفس تیز
تر چلنے لگا تھا۔

"مسباس پلیز۔ اگر میری آواز سن رہی ہو تو جواب دو۔
مسباس میری آواز آرہی ہے تمہیں۔" آواز اور
روشنی آہستہ آہستہ اس کے قریب آتی جارہی تھی مگر
یہ آواز اتنی صاف اور واضح نہیں تھی کہ وہ جان سکتی کہ
یہ کس کی آواز ہے۔ اس نے منہ پہ سختی سے ہاتھ جما کر
درخت کی اوٹ سے روشنی کی جانب دیکھنا چاہا تھا مگر تیز
بارش کی بوچھاڑ درمیان میں آگئی اسے کچھ بھی صحیح
طرح نظر نہ آیا۔ تب ہی اس کے پیر کے نیچے کوئی چیز
سرسرائی تھی۔ بے ساختہ اس کی چیخ نکل گئی اور
کوئی اگلے ہی لمحے اس کے سر پہ آن موجود ہوا تھا۔

"مسباس۔" ٹارچ کی روشنی اس کے چہرے پہ پڑی
تھی۔

"طلحہ۔۔۔ طلحہ۔" درخت کو چھوڑ کر وہ اس سے
لپٹ گئی۔ طلحہ نے بے اختیار اسے اپنے سینے سے
بھینچ لیا۔ وہ رونے لگی تھی۔ وہ اس کا سر تھپتھپانے
لگا۔ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ جو آہستہ آہستہ
سسکیوں میں بدلیں اور پھر وہاں خاموشی چھا گئی شاید وہ
ایک بار پھر بے ہوش ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ اسے اٹھا کر ہسپتال لے آیا جہاں چند ہی گھنٹوں
بعد اسے ہوش آگیا۔ ہوش میں آتے ہی اور طلحہ پہ
نظر پڑتے ہی وہ ایک بار پھر رونے لگی تو وہ اس کے پاس
بیٹھ کر اسے تسلی دلاسا دینے لگا۔ وہ اس سے لپٹ کر
پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔ "مجھے وہاں اکیلا چھوڑ کر
کیوں چلے گئے تھے آپ سب، کیا میں اتنی غیر اہم
ہوں کہ میری غیر موجودگی آپ میں سے کسی کو بھی
محسوس نہ ہوئی۔" وہ سب کو پرشکوہ نظروں سے دیکھ
رہی تھی۔ سب اسے اپنی محبت کا یقین دلا رہے تھے۔

اسی دن انہوں نے واپسی کے لیے رخت سفر باندھ
لیا۔ گھر پہنچے تو اس کی ماں اس کے سر اور پیر پہ بینڈیج
دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ باقی سب نے اتنا نوٹس نہ لیا۔

"یہ سر کہاں سے پھاڑا ہے تو نے۔۔۔؟" دادی نے
شاید موقعہ" پوچھ لیا تھا۔

"گر گئی تھی دادی۔" وہ تخت پہ بیٹھی پاؤں جھلانے

لگی۔
"کھائی میں؟" بے ساختہ پوچھا گیا۔
"خدانا خواستہ اماں۔ ایسے تو مت کہیں۔" سلائی کی مشین پہ جھکی اس کی ماں تڑپ ہی تو گئی تھی۔ اور اس تڑپ پہ برآمدے میں بچھی کرسی پہ بیٹھ کر اخبار کا مطالعہ کرتے ہاشم بخاری نے بہت ناگواری سے انہیں دیکھا تھا۔
"ہاں تو کیا ہوا۔۔۔ وہاں اکثر لوگ کھائیوں میں گر جاتے ہیں۔ پھر نہ تو ان کی ہڈیاں ملتی ہیں اور نہ ان کے نام و نشان۔۔۔ میں تو بس ایسے ہی پوچھ رہی تھی۔" دادی نے برا مان کر فٹ منہ بنایا وہ دونوں ماں بیٹی ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئیں تبھی مین گیٹ پہ دستک ہوئی تھی۔ ہاشم بخاری اٹھنے لگے لیکن اندر سے نکلتے طلحہ کو دیکھ کر وہیں بیٹھ رہے طلحہ گیٹ کھول کر باہر نکلا اور پھر جب واپس آیا تو اس کے چہرے کی رنگت اڑی ہوئی تھی۔
"کون ہے؟" ہاشم بخاری نے وہیں برآمدے سے پوچھا۔ وہ ہونٹ چباتا سمانہ بخاری کو دیکھنے لگا جو خود بھی اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔
"سیٹھ ظفراللہ مرزا۔"
"کیا۔۔۔؟" سمانہ بخاری کے ہاتھ سے قمیص جب کہ ہاشم بخاری کے ہاتھ سے اخبار نیچے گر گیا۔ دادی کی آنکھیں وہیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ جبکہ سباس نے چونک کر طلحہ کو دیکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

سیٹھ ظفراللہ مرزا اپنی بیٹی سے ملنے آیا تھا پورے بیس سال بعد۔
نہ جانے کون سی یاد اسے کھینچ لائی تھی ـــــ کس جذبے کے تحت وہ اپنی بیٹی کو دیکھنے آگیا تھا کس احساس کی بدولت وہ یہاں چلا آیا تھا۔ وہ بھی پورے بیس سال بعد، ہر کوئی حیران نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ ہر کوئی یقین اور بے یقینی کے درمیان لٹکا ہوا تھا پہلی بار تو اسے مایوس لوٹا دیا گیا مگر دوسری بار وہ زبردستی اندر گھس آیا۔
"میں اپنی بیٹی سے ملے بغیر واپس نہیں جاؤں گا۔" وہ اپنے مستحکم اور اٹل لہجے میں بولا تھا۔ قاسم بخاری اور ہاشم بخاری کو مجبوراً "چپ ہونا پڑا۔ دادی پہلے ہی خاموش بیٹھی تھیں۔
"تو اب پورے بیس سال بعد آپ کو یاد آئی اپنی بیٹی کی۔" سمانہ بخاری چپ نہیں رہ سکتی تھیں۔
"یاد تو پندرہ سال پہلے ہی آگئی تھی مگر آپ کے شوہر نامدار نے ہی یہاں آنے نہیں دیا ورنہ میں تو اپنی بیٹی کو بہت پہلے ہی یہاں سے لے جاتا۔" سیٹھ ظفراللہ نے بہت ہموار لہجے میں کہا تو سب ہی چونک کر ہاشم بخاری کو دیکھنے لگے۔ جو کھڑکی سے باہر نگاہیں جمائے بیٹھے تھے۔
"بہرحال جو بھی ہے اب میں اپنی بیٹی سے ملنے آیا ہوں۔ بہتر ہوگا آپ مجھے اس سے ملنے سے نہ روکیں۔"
"دیکھیں سیٹھ صاحب۔۔۔"
"مجھے دیکھنا ویکھنا کچھ نہیں ہے۔ صرف اپنی بیٹی سے ملنا ہے۔" ظفراللہ نے ہاتھ اٹھا کر قاسم بخاری کی بات کاٹی۔
"مگر وہ آپ سے ملنا نہیں چاہتی۔" قاسم بخاری بولنے سے باز نہیں آئے۔
"مگر میں تو اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"
"کس ناتے اور کس رشتے سے؟" سمانہ بخاری کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔
"وہ بیٹی ہے میری اور میں باپ ہوں اس کا۔"
"شکل یاد ہے اس کی؟" سمانہ بخاری ترش ہوئیں۔
"اب دیکھوں گا تو سب یاد آجائے گا۔"
"نہیں مرزا صاحب میں اسے آپ سے قطعی نہیں ملواؤں گی۔ مہربانی ہوگی آپ یہاں سے چلے جائیں۔"
"امپاسبل۔" انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔ "جب تک اپنی بیٹی سے مل نہ لوں اور اسے دیکھ نہ لوں۔ میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔"

"اے ہے اکڑ تو ایسے رہے ہو' جیسے بیٹی کو تو نے ہی پالا ہو۔ پہلے کیوں نہ خیال آیا اس کا' کیوں نہ اسے دیکھنے آئے کیوں نہ اسے ملنے آئے۔" دادی کو اس کا انداز ایک آنکھ نہ بھا رہا تھا۔ اسی لیے بھڑک اٹھیں۔

"میں کہہ تو رہا ہوں کہ مجھے انہوں نے روک دیا تھا انہوں نے ہی مجھے بیٹی سے ملنے نہیں دیا۔ اس نے ایک بار پھر ہاشم بخاری کی طرف اشارہ کیا' جو اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ٹھیک ہے آپ اس سے ملنا چاہتے ہیں تو مل لیں' ہمیں کوئی اعتراض نہیں' مگر شرط یہ ہے کہ اگر وہ آپ سے ملنا چاہے تو۔"

"آپ اس سے پوچھ لیں۔" ظفر اللہ نے ایسے کہا جیسے سپاس واقعی اس سے ملنا چاہے گی۔

"ٹھیک ہے۔ ابھی آپ جائیں ہم اسی سے پوچھ کر آپ کو بتادیں گے۔" ہاشم بخاری نے تیز نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے اسے جانے کا عندیہ دے دیا۔

"آپ ابھی اس سے پوچھ لیں۔"

"وہ پڑھنے گئی ہے۔ اس وقت گھر پہ نہیں ہے۔"

"آپ مجھے اس کی درسگاہ کا ایڈریس دے دیں۔" وہ بے چینی و بے تابی سے بولا۔

"سیٹھ صاحب ہم نے کہہ جو دیا کہ اگر وہ آپ سے ملنا چاہے گی تو ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا' ہم آپ کو فون پہ بتادیں گے' آپ اپنا کونٹیکٹ نمبر دے جائیے۔" ہاشم بخاری نے سختی سے کہا تو سیٹھ ظفر اللہ مرزا کو مجبوراً" چپ ہونا پڑا۔ وہ اپنا کونٹیکٹ نمبر دے کر چلا گیا تو سب کے ذہنوں میں یہ سوال بے چینی کی مانند کلبلانے لگا۔ کہ ہاشم بخاری نے اس سے پہلے اپنی بیٹی سے رابطہ کرنے کیوں نہیں دیا۔

☆ ☆ ☆

سمانہ بخاری نے اس سے باپ سے ملنے کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ بھی جانتی تو سب تھی مگر اپنی ماں کو متوقع تکلیف سے بچانے کی خاطر اس موضوع پر بات کرنے سے کترانے لگی۔ گھر میں عجب طرح کی ٹینشن پھیلی ہوئی تھی۔ دادی ہر وقت ہی بھری رہتیں' کبھی سیٹھ ظفر اللہ کو گالیاں اور کوسنے دیتیں (جو اتنے عرصہ بعد ادھر آن دھمکا تھا) اور کبھی ان دونوں ماں' بیٹی کو صلواتیں سنانے لگتیں۔ جنہوں نے پچھلے بیس سالوں سے ان کا چین و سکون غارت کر رکھا تھا۔

انہیں سمانہ بخاری سے پہلے تو کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی مگر جب سے وہ اپنے پہلے شوہر سیٹھ ظفر اللہ مرزا سے طلاق لے کر اپنے چچا آغا جان کے گھر دوبارہ سے واپس آئی تھیں وہ ان کی جان کی دشمن بن گئی تھیں۔

سمانہ بخاری کو ان کے چچا (آغا جان) نے ہی پالا تھا کیونکہ بہت عرصہ پہلے ہی ان کے کی والدین کی ڈیتھ ہو چکی تھی۔ انہوں نے ہی اسے اپنے ایک دیرینہ دوست کے بیٹے ظفر اللہ مرزا کے ساتھ بیاہا اور اس کے فرض سے سبکدوش ہو گئے مگر بد قسمتی سے یہ شادی نبھ نہ سکی۔ ظفر اللہ مرزا ایک آوارہ اوباش اور بد قماش شخص تھا۔ جو عورت اور پیسے کے پیچھے بھاگتا تھا۔

سمانہ بخاری نے پہلے تو اسے بہت سمجھانے کی کوشش کی اور اپنا گھر بسائے رکھنا چاہا مگر بد قسمتی سے وہ ناکام رہیں۔ بعد میں تنگ آکر انہوں نے صلح جو خاموشی اختیار کر لی مگر قسمت پھر بھی ان پہ مہربان نہ رہی۔ سیٹھ ظفر اللہ کو اولاد کی چاہ لگی تو وہ ان سے بیٹے کا مطالبہ کرنے لگا پہلے ڈیڑھ سال تک تو وہ پریگننٹ ہی نہ ہو سکیں اور پھر جب ہوئیں تو بیٹے کے بجائے' بیٹی نے ان کی گود میں آنکھ کھولی۔ ظفر اللہ کو بس بہانہ چاہیے تھا۔ اس نے انہیں بیٹی سمیت چچا کے گھر واپس بھجوا دیا اور خود گھر میں دوسری بیوی کے ساتھ رہنے لگا جو نہ جانے کب اس نے کی تھی۔ آغا جان نے پہلے پہل تو اسے لاکھ سمجھایا بجھایا لیکن پھر اس کی ہٹ دھرمی دیکھ کر اس سے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ جو اس نے کچھ ہی دنوں بعد دے دی۔

پہلے بھی ان کا ہر فیصلہ آغا جان ہی کرتے تھے جب ایک بار پھر اس کی قسمت کا فیصلہ ہوا تو اس نے احتجاج

کردیا۔ وہ ہاشم بخاری سے قطعی" شادی کرنا نہیں چاہتی تھیں۔

ہاشم بخاری نے باپ کے کہے پر سر جھکادیا۔ جبکہ وہ احتجاج کرتی رہ گئیں اور یہ ان کا احتجاج کیا تھا ہاشم سے ان کے تین بیٹے (غنی عالی اور علی) اور دو بیٹیاں (ضویا اور مبشرا) ہوئی تھیں لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں ہاشم بخاری ان سے کبھی خوش نہ ہوسکے اور وہ انہیں خوش کرنے کی خاطر ہلکان ہوتی چلی گئیں ادھر دادی ان کی چچی ان سے کافی ناخوش ہوگئی تھیں اور ان کی جانی دشمن بن گئی تھیں کیونکہ وہ اپنے سب سے چھوٹے اور لاڈلے بیٹے کی شادی اپنی بھتیجی سے کرنا چاہتی تھیں جو انہیں بہت عزیز تھی مگر آغا جان نے ان کی یہ خواہش پوری نہیں ہونے دی تھی اسی لیے سمانہ بخاری اور ان کی بیٹی سباس انہیں چبھتی تھیں۔ جتنی نفرت وہ خود ان سے کرتی تھیں اتنی ہی نفرت وہ ہاشم بخاری کی آنکھوں میں بھی ان کے لیے دیکھنا چاہتی تھیں جس میں وہ خاصی کامیاب رہی تھیں۔

سمانہ بخاری بھی اس گھر میں وہ مقام حاصل نہ کرسکیں جو شادی سے پہلی ان کا اس گھر میں تھا۔ اپنی سگی اور جائز بیٹی کے ساتھ عجیب چوروں کی طرح زندگی گزار رہی تھیں وہ۔ سباس ان کے اس طرح زندگی گزارنے پر بہت خفا رہتی تھی اور انہیں حق سے جینے کا کہتی تھی مگر وہ کبھی بھی اس گھر میں اپنی اہمیت جتا نہ سکیں (جس پہ سباس غصہ ہوتی اسی لیے وہ دادی کو ستانے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتی تھی)

اور ان کی یہ اہمیت اس وقت اور گھٹ کر رہ گئی جب ایک بار پھر آغا جان نے ان پہ اپنا فیصلہ مسلط کیا۔ مگر اب کی بار اس فیصلے کی زد میں وہ اکیلی نہیں آئی تھیں۔ بلکہ ساتھ ان کی بیٹی بھی آئی تھی۔

گھر کے سارے فیصلے آغا جان ہی کرتے تھے اور گھر میں کوئی ان کے فیصلوں کے سامنے سر نہیں اٹھاتا تھا۔ اسی لیے ایک بار پھر سب کو مجبورا" سر جھکانا پڑا۔

سباس نے متوقع صورتحال کو جانچتے ہوئے آغا جان کو اس فیصلے سے ہٹانا چاہا تھا' انہیں پیچھے کرنا چاہا تھا۔ انہیں اپنے اور طلحہ کے بارے میں تمام اونچ بتانا چاہی تھی مگر وہ سن کر نہ دیئے' طلحہ نے بھی احتجاج کیا' سباس سے نکاح کرنے سے صاف صاف انکار کردیا مگر وہ آغا جان تھے۔ اپنا فیصلہ مسلط کرکے رہے۔

دادی اور کنیز فاطمہ کو اس رشتے پہ سو فیصد اعتراض تھا۔ انہوں نے بھی اس فیصلے کو آخری وقت تک جھٹلایا تھا مگر ہونی کو کون ٹال سکتا ہے' جو ہونا تھا ہو کر رہا۔ آغا جان نے کسی کی ایک نہ سنی۔

اس فیصلے سے انہیں تو کچھ نہ ہوا لیکن اس فیصلے کی زد میں سمانہ بخاری اور سباس آگئی تھیں' وہ پہلے ہی اس گھر میں "فالتو" کی حیثیت سے رہتی تھیں اب اور غیر محفوظ ہوگئیں کیونکہ دادی اور چچی کے ساتھ ان کے مجازی خدا بھی تو انہیں ناپسند کرتے تھے' پھر کیا حیثیت تھی ان کی اس گھر میں اور وہ کس برتے پر یہاں اکڑتیں۔

"ویسے سباس سچ سچ بتاؤ۔ کیا تمہارا دل نہیں کرتا کہ اپنا باپ دیکھو ان سے ملو ان سے باتیں کرو۔۔۔؟" وہ سیڑھیوں سے نیچے پاؤں لٹکائے بیٹھی انار سے دانے نکال نکال کر منہ میں ڈال رہی تھی جب ندا نے اس کے پاس بیٹھ کے اچانک اس سے پوچھا۔

"او۔ ہوں۔۔۔" اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کیوں؟"

"بس ویسے ہی۔۔۔" اس نے کندھے اچکا کر ایک انار اسے پیش کیا جو اس نے فورا" قبول کرلیا۔

"لیکن پھر بھی۔۔۔ وہ باپ ہیں تمہارے۔۔ اور زندہ سلامت ہیں۔۔۔ جی تو چاہتا ہوگا نا کہ۔۔۔؟"

"جی تو اس کا چاہے جس نے کبھی باپ کی شفقت دیکھی ہو جب کہ یہاں تو ایسا کچھ نہیں ہے۔" اس نے اداسی سے آسمان کی طرف دیکھا ندا کا دل کٹ کر رہ گیا۔ "پھر بھی تمہیں اگر ان سے ملنے کے لیے کہا جائے تو۔۔۔؟"

"تو میں پھر بھی ان سے نہیں ملوں گی۔"

"کیوں؟" ندا نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"کیونکہ میں ہمیشہ سگی محبتوں اور شفقتوں سے محروم رہی ہوں' اسی لیے اب بھی محروم ہی رہنا چاہوں گی۔ میں کسی کی سگی و سچی محبت کا خود کو عادی نہیں بنانا چاہتی۔"

"تم ایک دم غلط بات کر رہی ہو۔۔" ندا کو اس کی سوچ سراسر غلط اور بچکانہ لگی تھی۔

"اگر تم میری جگہ ہوتیں تو تم بھی ایسی ہی بات کرتیں۔" اس کے لہجے میں اداسی اور انداز میں شکست سی تھی۔ ندا کچھ بول نہ سکی۔ بس لب بھینچے اسے دیکھتی گئی۔

☆ ☆ ☆

سمانہ بخاری نے تو نہیں البتہ قاسم بخاری نے اسے سیٹھ ظفر اللہ مرزا سے ملنے کا کہا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ سیٹھ ظفر اللہ اس کے بعد گھر نہیں آیا تھا البتہ فون پہ رابطہ رکھے ہوئے تھا اور اس سے بات کرنے کے لیے مسلسل اصرار کر رہا تھا۔

اس کی بے چینی و بے تابی دیکھ کر مجبوراً" سمانہ بخاری کو اسے کہنا پڑا کہ کم از کم وہ اس سے فون پہ بات ہی کر لے مگر آگے سے وہ بھڑک ہی اٹھی۔

"نہیں امی۔ قطعی نہیں۔ جس شخص نے مجھے گھر میں دس دن بھی رکھنا گوارا نہ کیا۔ ناجائز اولاد کی طرح اٹھا کر گھر سے باہر پھینک دیا۔ میں اس سے کبھی نہیں مل سکتی۔ میں اس سے ملنا چاہوں بھی تو یہ دل نہیں مانے گا۔" اس نے فوراً" سے پیشتر انکار کیا تھا۔

"وہ باپ ہے تمہارا۔"

"بے شک۔ لیکن یہ خیال انہیں تب کیوں نہیں آیا' جب میں پیدا ہوئی جب مجھے باپ کی محبت کی ضرورت تھی' ان کا شفیق سایہ چاہیے تھا۔ ان کے مضبوط اور مہربان ہاتھوں کی طلب تھی۔ تب وہ کہاں تھے۔ تب انہیں میرا خیال کیوں نہیں آیا۔ میں تو ان کے سینے پہ سر رکھ کر سونا چاہتی تھی۔ غنی ضوبا علی کی طرح ان کی انگلی پکڑ کر چلنا چاہتی تھی۔ اپنے دل کی گہرائیوں سے انہیں ابو کہنا چاہتی تھی' تب انہوں نے میرا خیال کیوں نہیں کیا؟ کیوں وہ میرے پاس نہیں آئے۔" یکدم وہ جذباتی سی ہو گئی تو سمانہ بخاری دکھ سے اسے دیکھنے لگیں۔

"تب وہ ہوش میں نہیں تھا بیٹا' وہ مدہوشی کی زندگی جی رہا تھا' دولت کے نشے نے اندھا کر رکھا تھا۔"

"تو اب وہ کیا لینے آئے ہیں۔ اب بھی جائیں دولت کے پیچھے بھاگیں روپوں کے پیچھے۔۔" اس نے تیزی سے اپنی ماں کی بات کاٹی۔

"وہ کیا سمجھتے ہیں کہ اب مجھے ان کے پیسوں کی ضرورت ہے ان کے روپوں کی ضرورت ہے۔۔ نہیں ضرورت تو مجھے تب تھی۔ جب مجھے اس گھر میں ندا کے مقابلے میں دودھ کم دیا جاتا تھا' ضرورت تو تب تھی جب میں ندا کے اترے کپڑے پہنتی تھی۔ اس کے کھلونوں سے کھیلتی تھی' ضرورت تو تب تھی امی جب گھر کے سب بچوں کو پرائیویٹ اور مجھے فیس کی وجہ سے سرکاری اسکول میں داخل کرایا گیا۔ جب میں نئے یونیفارم اور نئے جوتوں کے لیے ترستی تھی۔ جب میں طلحہ کی پھٹی پرانی کتابیں لے کر اسکول جاتی تھی' مجھے روپوں پیسوں کی ضرورت تب تھی اب نہیں۔"

اس نے تیزی سے نفی میں سر ہلایا۔ اس کی ماں ہونٹ کچلنے لگی۔

"ساری زندگی میں نے اسٹور میں رہ کر گزاری اندھیرے اور کم روشنی نے ہمیشہ میرا مذاق اڑایا۔ ٹوٹی چارپائی نے ہمیشہ مجھے میری کسمپرسی کا احساس دلایا۔ پھٹے بستر نے ہمیشہ مجھے مفلسی اور بے چارگی کا طعنہ دیا۔

امی تب تو انہیں میرا خیال نہیں آیا اور اب۔ اب وہ میرے دعوے دار بن گئے ہیں کیا یہ دعوا کرنا ان کو زیب دیتا ہے۔" اس کا لہجہ ترش ہوا تھا۔ "ان کی بیٹی نے ہمیشہ غیروں کی گالیاں کھائی ہیں جوتیاں کھائی ہیں' اس کی ساری زندگی طعنوں' تشنوں میں گزری ہے لوگوں کی باتیں سنتے ہوئے گزری ہے صرف۔۔ صرف ایک گھر کی خاطر۔۔ تاکہ اسے یہاں رہنے دیا جائے یہاں سے نکالا نہ جائے کہیں اسے بے گھر نہ کر دیا

جائے۔"

بولتے بولتے یکدم اس کی آواز رندھ گئی اس کی ماں چاہتے ہوئے بھی آنسو روک نہ سکی۔

"امی آپ کے ہوتے ہوئے بھی جس طرح کی زندگی میں نے یہاں گزاری ہے۔ وہ صرف میں ہی جانتی ہوں۔ اس گھر میں رہ کر جس اذیت اور تکالیف کا سامنا مجھے کرنا پڑا ہے اس سے صرف میں ہی واقف ہوں کیا نہیں ملا مجھے اس گھر سے۔" یکدم وہ رو پڑی۔ اس کی ماں تڑپ ہی تو گئی تھی۔ کھینچ کر اسے ساتھ لگا لیا تھا۔

"بچپن سے لے کر آج تک اک "فالتو" کی حیثیت سے رہ رہی ہوں یہاں' ہمیشہ طعنے تشنے گالیاں اور جوتیاں کھائی ہیں اس گھر سے' دادی' تائی اور آپ کے شوہر کے منہ سے ہمیشہ اپنے لیے برے الفاظ ہی سنے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں ہمیشہ اپنے لیے نفرت ہی دیکھی ہے' لیکن پھر بھی ڈھیٹ بنی یہاں پڑی رہی بے غیرتوں' بے شرموں کی طرح زندگی گزارتی رہی۔" وہ اپنی ماں کو کبھی شرمندہ نہیں کرنا چاہتی تھی مگر جو جذباتی ہوئی تو روتے روتے سب کچھ اس کے منہ سے نکل گیا۔

"آپ نہیں جانتیں امی۔ اس سارے وقت میں' میں نے اپنے سگے باپ کو کتنا یاد کیا ہے۔ کس قدر ان کی چاہ کی ہے۔ بچپن سے لے کر آج تک دل سے آواز دیتی رہی ہوں انہیں۔

دن رات پکارتی رہی ہوں انہیں۔۔۔ مگر میری آواز کب انہوں نے سنی' کب میری پکار کا جواب دیا۔۔ ہوتے ہوئے بھی وہ نہیں تھے۔۔ کیوں۔۔۔ کیوں؟؟" روتے روتے یکدم وہ چلانے لگی۔

"کیا میں ان کی جائز اولاد نہیں تھی' کیا میں ان کی سگی اولاد نہیں تھی' کیا جب مجھے چوٹ لگتی تھی ادھر انہیں احساس نہیں ہوتا تھا' کیا وہ اتنے بے حس تھے اتنے بے مہر تھے کہ مجھے ہی بھول گئے۔ اپنی سگی اولاد کو ہی بھول گئے؟؟"

اس ساری باتوں کا بھلا سمانہ بخاری کے پاس کیا جواب ہو سکتا تھا۔ وہ چپ چاپ بہتے آنسوؤں سمیت اسے دیکھے گئیں۔ جو زار و قطار روئے جا رہی تھی۔ جس کے منہ سے نکلا ہر لفظ کڑوا مگر سچا تھا۔ جسے وہ کبھی جھٹلا نہ سکتی تھیں۔

"امی اب نہیں۔" روتے روتے ایکدم وہ اپنا سر نفی میں ہلانے لگی۔ "آپ ان سے کہہ دیجیے کہ اب نہیں۔ اب وقت ان کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ اب نہ تو وقت ان کا ساتھ دے گا اور نہ ان کی بیٹی۔ جیسے وہ آئے ہیں۔ ویسے ہی وہ لوٹ جائیں۔ اب انہیں یہاں سے کچھ نہیں ملنے والا۔ کل انہوں نے مجھے دیکھنا گوارہ نہیں کیا تھا آج میں انہیں دیکھنا نہیں چاہتی۔ کل ان کے لیے مری ہوئی تھی۔ آج وہ میرے لیے مرے ہوئے ہیں۔۔۔"

"سباس بیٹا ایسے مت کہو۔" پیچھے سے کسی کی بھاری مگر اک تڑپ میں لپٹی آواز ابھری تھی' دونوں نے بے اختیار پیچھے دیکھا تھا۔

سیٹھ ظفر اللہ مرزا (جو سباس کے لیے بالکل اجنبی تھا) ہاشم بخاری اور ڈاکٹر طلحہ کے ساتھ سامنے والے دروازے میں کھڑا تھا۔

ہاشم بخاری کا سر جھکا ہوا تھا جبکہ طلحہ کا چہرہ اور آنکھیں بے تحاشا سرخ ہو رہی تھیں۔

"کل میں بھٹکا ہوا تھا بیٹا کھوٹی راہ پہ چل پڑا تھا' جان بوجھ کے تم لوگوں کے ساتھ برا کیا۔ مجھے معاف کر دو بیٹا۔"

"تو آپ ہیں میرے باپ۔۔۔؟" آنسو پونچھ کر اس نے اس شخص پہ ایک سرد اجنبی سی نگاہ ڈالی جو ظفر اللہ مرزا کے اندر تک اتر گئی۔ اس نے بے اختیار اثبات میں سر ہلایا۔ جب کہ وہ ہونٹ بھینچ کر نفی میں گردن ہلانے لگی۔

"بہت اچھے۔۔۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو اپنا باپ نہیں مانتی۔" اس کا لہجہ برفیلا اور انداز سپاٹ تھا آنکھوں میں بے حد اجنبیت تھی۔

"ایسے نہ کہو بیٹا۔ میں تم سے ملنے آیا ہوں۔ باپ ہوں میں تمہارا۔"

"مجھے بار بار بیٹا مت کہیں۔۔۔ نہ آپ میرے باپ ہیں اور نہ میں آپ کی اولاد مجھے افسوس ہے کہ آپ کو یہاں سے مایوس لوٹنا پڑے گا۔"

"سمانہ آپ ہی اسے سمجھائیں۔"

"سیٹھ صاحب گڑگڑانے کی ضرورت نہیں' جب میں ہی آپ سے ملنا نہیں چاہتی تو یہ سب کیا کریں گے بہتر ہے آپ اپنا مزید وقت برباد نہ کریں اور خاموشی سے یہاں سے چلے جائیں۔" لہجہ گلوگیر تھا جب کہ آواز رندھی ہوئی تھی مگر پھر بھی وہ سختی سے بولی۔

"بیٹھنا چاہتے ہیں تو ان کے پاس بیٹھیے مگر مجھ سے کوئی امید نہ لگائیے گا۔ اللہ حافظ۔" تیزی سے اپنے باپ کی بات کاٹتی وہ ساتھ والے کمرے میں چلی گئی۔ سب ہی سر جھکائے کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔

☆ ☆ ☆

حیرت انگیز طور پر اس کے بعد سیٹھ ظفر اللہ مرزا نے خاموشی اختیار کر لی۔ نہ تو وہ بعد میں اس گھر میں آیا اور نہ کوئی فون وغیرہ کیا۔ اسے بھی بعد میں کسی نے کچھ نہیں کہا تھا اس کی روٹین اسی طرح جاری تھا۔ صبح یونیورسٹی دن کو بکرے کی خدمت اور شام کو آفس وہ آفس چار بجے سے آٹھ بجے تک جاتی تھی۔ پانچویں جماعت میں تھی۔ جب اس نے گھر میں بچوں کو بیس بیس' تیس تیس روپے لے کر پڑھانا شروع کیا تھا پھر میٹرک تک آتے آتے اس نے کمپیوٹر کورس کر لیا اور پھر اس کے بعد کمپیوٹر اکیڈمی جوائن کر لی جہاں سے اسے اچھی خاصی تنخواہ مل جاتی کہ وہ اپنی تنخواہ سے ہی اپنی فیس اور کپڑوں جوتوں کا خرچہ نکالنے لگی۔ اپنے کھانے پینے کی چیزیں بھی اکثر و بیشتر وہ خود ہی لے کر آتی تھی اور یہ سب کچھ گھر والوں سے ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ سب ہی جانتے تھے کہ وہ بچپن سے اپنا بوجھ خود اٹھائے ہوئے ہے۔ اب پچھلے دو سالوں سے اس نے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں کمپیوٹر آپریٹر کی جاب حاصل کر لی تھی۔ اور اس کے یہ جاب کرنے پر سوائے آغا جان کے کسی نے اعتراض نہیں کیا تھا۔ (آخر پرایا بوجھ کوئی کہاں تک ڈھو سکتا ہے۔)

آغا جان کا سعودی عرب سے فون آیا تو قاسم بخاری نے انہیں اس معاملے کے متعلق بتا دیا جس پہ پہلے تو وہ ناراض ہوئے پھر صورت حال کی نزاکت سمجھتے ہوئے سباس کو باپ سے ملنے کے متعلق سمجھانے لگے' اس نے انہیں بھی وہی جواب دیا جو قاسم بخاری اور سمانہ بخاری کو دے چکی تھی یعنی "نہیں نہ آج نہ کل۔۔۔"

پھر انہوں نے قاسم بخاری کو کہہ دیا کہ میں آؤں گا تو دیکھ لوں گا فی الحال اس معاملے کو یہیں رہنے دیا جائے۔ اور اس بات پہ قاسم بخاری نے سر ہلا دیا تھا۔

مگر یہ نوبت ہی نہ آئی۔ اس سے پہلے ہی بخاری ہاؤس میں وہ سب کچھ ہو گیا جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ اور ندا یونیورسٹی سے لوٹیں تو گھر میں عجب طرح کا شور مچا ہوا تھا' وہ دونوں ہی یہ سمجھنے سے قاصر تھیں کہ یہ شور کیسا ہے اسی لیے وہ معاملے سے بے خبر اس طرف چلی گئیں جس طرف اونچا اونچا بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ بڑے کمرے میں داخل ہوئیں تو سامنے ہی دادی' سمانہ بخاری' کنیز فاطمہ' عاصمہ' مبشرا اور زویا بیٹھی تھیں۔ دادی کے منہ سے کف نکل رہا تھا جبکہ باقی سب کے چہروں پہ سنجیدگی اور خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

"کیا ہوا؟" سب کو باری باری دیکھتے ہوئے آخر ندا نے پوچھنے کی ہمت کر ہی لی جبکہ وہ خاموشی سے اپنی ماں کا چہرہ دیکھنے لگی جن کے ہونٹ بھینچے ہوئے اور آنکھیں سخت ضبط کی وجہ سے بے تحاشا سرخ ہو رہی تھیں۔

(دوسرا اور آخری حصہ آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں)

JULY 2009

ماہنامہ کرن

اس شمارے کے ساتھ
کرن کتاب
کرن یکوان

نادیہ جہانگیر

ڈائجسٹ ناولز لورز گروپ

"ارے۔ یہ پوچھو کیا نہیں ہوا۔ ہمارے ناک تلے کھیل کھیلا جاتا رہا اور ہم ایسے بے خبر رہے کہ کچھ سمجھ ہی نہ سکے۔" دادی نے تقریباً" سینہ ہی پیٹ ڈالا' وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔

"میں پہلے ہی کہتی تھی اس کے چال چلن شروع سے ہی ٹھیک نہیں' یہ ضرور کوئی نہ کوئی جھنڈا چڑھائے گی۔ مگر میری سنتا کون ہے' کھلی چھٹی دے دی اسے۔ کہ جاؤ بی بی' جو کرنا ہے وہ کرو' پھانسو جا کے غیر مردوں کو۔ جاؤ قابو کرو ان مردودوں کو۔"

ناولٹ

"پلیز اماں۔" سمانہ بخاری نے تڑپ کر انہیں دیکھا تھا۔

"پھر بھی پتا تو چلے ہوا کیا ہے؟" وہ دونوں کچھ بھی تو سمجھ نہ پا رہی تھیں۔

"اس سے پوچھو' جسے باہر کی ہوا بھی راس نہ آئی۔ وہاں بھی یہ اپنا آپ دکھانے سے باز نہ آئی۔" دادی نے قہر آلود نظروں سے سباس کو دیکھا تو سباس کے ہاتھ کی گرفت کندھے سے لٹکتے بیگ کے اسٹریپ پہ کمزور پڑ گئی۔

"مجھے تو پہلے ہی خبر تھی کہ اس جیسی لڑکیاں عزت سے رہنا نہیں چاہتیں۔ جن کے دیدے پہلے دن سے ہی بے باک ہو جائیں بھلا انہیں اپنے اماں باوا کی عزت کی کیا پروا' وہ ایک نہ ایک دن ان کی عزتیں نیلام کر کے ہی چھوڑتی ہیں اور اس کو دیکھ کے تو کوئی شک ہی نہیں رہتا۔" انہوں نے نخوت سے سر جھٹکا۔ تو سباس کے ماتھے پہ بل پڑ گئے۔ اس نے انہیں کڑی نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنی ماں کے بہتے آنسوؤں کی طرف دیکھا تھا اور پھر چلتی ہوئی ان کے پاس آن رکی۔

"کیا بات ہوئی ہے امی۔ کس چیز نے انہیں آگ لگا رکھی ہے؟"

"اے۔ ہے منہ سنبھال کے بات کر۔ غیر مردوں کو اس گھر کا رستہ بھی دکھا دیا ہے۔ اب یہ ہاشم اور طلحہ بجھاتے ہیں تیری یہ جوانی کی آگ۔" دادی کو تو گویا منکے لگ گئے تھے اس کے بات سن کر' فوراً" بھڑک اٹھیں۔

"دادی آپ حد سے بڑھ رہی ہیں۔ اگر میں نے کچھ کہا تو برا آپ کو ہی لگے گا۔" اس نے مڑ کے سخت اور زہریلے لہجے میں ان سے کہا تھا۔

"آخر ہوا کیا ہے۔ کچھ ہمیں بھی تو پتا چلے۔" ندا جھنجلا پڑی تھی۔

"یہ تمہیں سباس ہی بتا سکتی ہے' ہمیں اس سے ایسی امید نہیں تھی کچھ اور نہ سہی یہ میرے بیٹے کی عزت کا ہی خیال کر لیتی۔ یہ کسی کی منکوحہ ہے اتنا تو اسے پاس رکھنا چاہیے تھا۔" تائی سنجیدگی سے اٹھیں اس کے پاس رک کر اسے کڑے تیوروں سے گھورتے ہوئے غصے سے کہا اور کھلے دروازے سے باہر نکل گئیں۔ وہ لب بھینچے انہیں دیکھے گئی۔

ندا نے اب کی بار عاصمہ' زویا اور مبشرا کو سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔ سب ہی افسوس سے دادی اور

تائی کو دیکھ رہی تھیں۔
"کچھ عورتیں آئی تھیں سباس کا رشتہ لے کر۔" عاصمہ نے زبان کھولی تھی۔
"بس۔" ندا نے صدمے سے دادی کو دیکھا جبکہ سباس نے حیرت سے اپنی ماں کو۔

☼ ☼ ☼

اس کے لیے رشتہ آیا تھا کسی میر حسن نامی شخص کا اس نام اور اس کے خاندان سے کوئی واقف نہ تھا۔ یہ رشتہ کیوں اور کس وجہ سے آیا تھا۔ کوئی نہ جانتا تھا۔ کسی کی نہ جان پہچان تھی اس نام سے اور نہ کوئی اس سے پہلے اس نام سے واقف تھا۔

دادی کو تو بہانہ چاہیے تھا عورتوں کے منہ سے رشتے کی بات سنتے ہی بھڑک اٹھیں' ساتھ تائی بھی طیش میں آگئیں۔ سمانہ بخاری کو تو گویا بات سنتے ہی سانپ سونگھ گیا وہ کچھ بول ہی نہ سکیں۔ عاصمہ نے سہولت سے بات کو سنبھالا اور ان عورتوں سے معذرت کرلی۔ مگر جاتے جاتے وہ عجیب سی بات کہہ گئیں۔

"اپنی بیٹی سے پہلے پوچھ لیجیے گا۔ ہم پھر آئیں گے۔"

جو شک و شبہ پیچھے رہتا تھا' رہی سہی کسر اس بات نے پوری کردی۔ ان عورتوں کے جاتے ہی دادی اور تائی نے آسمان سر پہ اٹھالیا۔

سباس تو یہ نام ہی پہلی بار سن رہی تھی۔ ذہن پہ زور ڈال ڈال کے تھک گئی کہ یہ ہے کون اور اسے کس طرح جانتا ہے۔ سمانہ بخاری کے پوچھنے پہ بھی اس نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تھا انہوں نے یقین کیا یا نہیں مگر یہ معمہ اگلے ہی سنڈے کو حل ہوگیا جب گھر کے سارے افراد ڈائننگ ٹیبل پہ موجود لنچ کررہے تھے۔ کچھ مہمانوں کی خبر پر قاسم بخاری اٹھ کر ڈرائنگ روم میں چلے گئے اور پھر کچھ ہی دیر بعد انہوں نے ڈرائنگ روم میں دادی' کنیز فاطمہ' ہاشم بخاری اور سمانہ بخاری کو بلا بھیجا اور ان کے ساتھ ہی سباس کا بلاوا بھی آگیا۔

وہ حیران حیران سی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی' ایک دم سے ٹھٹک گئی۔ سب کی نظریں اسی پہ لگی تھیں جبکہ وہ سامنے بیٹھے شخص کو دیکھ رہی تھی جو اس کا شناسا سا تو تھا لیکن نا آشنا تھا کیونکہ وہ اس شخص کا نام نہیں جانتی تھی۔ واقف تھی تو صرف اتنی کہ وہ اسے "فورٹ منرو" میں ملا تھا۔ اور جو بار بار اس کا پیچھا کرتا تھا۔

"جانتی ہو اس شخص کو۔۔؟" پوچھنے والا کوئی اور نہیں اس کی ماں کا شوہر ہاشم بخاری تھا۔ اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے طلحہ کو دیکھا۔۔ جو سرخ چہرہ اور لال انگارہ آنکھیں لیے اسے دیکھ رہا تھا۔

"میں پوچھ رہا ہوں جانتی ہو اسے۔۔ کون ہے یہ شخص۔۔؟" ہاشم بخاری دوسری بار پھر گرجے تھے۔ وہ کچھ بول نہ سکی اپنی ماں کو دیکھنے لگی۔

"ارے یہ کیا بولے گی۔۔ اب تو اسے گونگا بننا ہی ہے' جو چاند یہ چڑھانا چاہتی تھی۔ اب تو وہ سب کی نظروں میں آگیا ہے اب تو اسے چپ لگے گی ہی۔ بولتی تو بند ہوگی ہی نا۔۔" دادی کو تو پھپھولے پھوڑنے کا موقع مل گیا تھا پھر کیسے وہ چوکتیں۔

"دیکھیں بخاری صاحب۔"

"آپ خاموش رہیں۔ ہم آپ سے بات نہیں کررہے۔" اس شخص (میر حسن) کے ساتھ بیٹھے شخص نے کچھ کہنا چاہا تھا مگر ہاشم بخاری نے اپنے مخصوص ترش — بلے لہجے میں اسے ٹوک دیا۔

"انکل پلیز آپ ہماری بات تو سنیں۔" اب کی بار میر حسن بولا تھا مگر ہاشم بخاری نے ہاتھ اٹھا کر اسے کچھ بھی کہنے سے باز رکھا۔

"ہم آپ سے نہیں۔ اپنی لڑکی سے کچھ پوچھ رہے ہیں۔ بہتر ہوگا آپ خاموش بیٹھیں۔"

"مگر انکل یہ تو ہمیں۔"

"میں نے کہا ہے آپ خاموش بیٹھیں۔ مہمان ہیں' اس لیے ہم آپ کی عزت کررہے ہیں ورنہ اب تک ہم آپ کو باہر کی راہ دکھا چکے ہوتے۔"

"بخاری صاحب آپ خوامخواہ غصہ ہو رہے ہیں۔ اطمینان سے بیٹھ کر آپ ہماری بات سن لیں تو اصل بات سب کی سمجھ میں آجائے گی۔" ساتھ آئے شخص نے پھر سے کچھ کہنا چاہا تھا۔

"آپ کو یہاں بیٹھنا ہے یا باہر جانا ہے؟" ہاشم بخاری نے گھور کر اس شخص کو دیکھا تھا ان کے ساتھ آئی عورتیں ایک دوسرے کو دیکھنے لگی تھیں۔ قاسم بخاری نے بھائی کے کندھے کو تھوڑا سا دبایا مگر وہ پھر اسی شخص کو گھور رہے تھے جو ٹکر ٹکر سب کی شکلیں دیکھ رہی تھی۔

"یہ شخص تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ تم کو اور تم اس کو "اچھی طرح" جانتے ہو اسی لیے آج یہ تمہارے لیے پرپوزل لے کر آیا ہے۔" ماتھے پہ تیوری سجائے آنکھوں میں نفرت کی چنگاریاں لیے خشونت اور نفرت بھرے لہجے میں ہاشم بخاری نے اس سے کہا تو وہ طلحہ اور اپنی ماں کو دیکھتی نفی میں سر ہلانے لگی۔

"میں نہیں جانتی اس شخص کو۔"

"جھوٹ مت بولو۔" "مجھ سے قسم لے لیں میں اس شخص کو نہیں جانتی۔ میں تو اس شخص کے نام تک سے واقف نہیں۔" اسے پتا بھی نہ چلا وہ منمنانے لگی تھی۔

"بخاری صاحب بچی درست کہہ رہی ہے؟"

"حسین صاحب ہم گھر آئے مہمانوں کی بڑی عزت کرتے ہیں اس سے پہلے کہ اس عزت میں کوئی کمی آجائے، آپ یہاں سے جاسکتے ہیں۔" انہوں نے تمام مروت بالائے طاق رکھ کر ان آئے لوگوں کو یہاں سے اٹھ جانے کا پیغام دے دیا۔

"لیکن ہماری بات تو سنیں؟"

"ہم نے جو کہہ دیا سو کہہ دیا، پلیز آپ ہمارا اور اپنا تماشا نہ کریں۔ دروازہ کھلا ہے۔ پلیز۔" انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں باہر کا راستہ دکھایا۔

"انکل بس۔"

"آپ یہاں سے جاسکتے ہیں۔" ان کا لہجہ سخت، مضبوط مستحکم اور ہموار دیکھ کر وہ چاروں مہمان ایک دوسرے کو دیکھتے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے انداز میں بے بسی نمایاں تھی۔

"بخاری صاحب اگلے کی بات کو ٹھنڈے دل و دماغ سے سن لینا چاہیے۔ اس میں صرف دوسرے کا ہی نہیں اپنا بھی فائدہ ہوتا ہے۔ پلیز آپ بچی کو کچھ مت کہیے گا وہ واقعی ہم سے ناواقف وانجان ہے۔ ہم یہ رشتہ اپنی خواہش و مرضی سے لے کر آئے ہیں۔ یہ بچی واقعی بے خبر ہے۔" جاتے سمے چاروں مرد اور عورتیں ان کے پاس رکے اور ذرا بڑی عمر کے مرد نے جنہیں ہاشم بخاری نے حسین صاحب کہا تھا ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے کہا اور پھر اللہ حافظ کہتے باہر نکلنے لگے کہ امیر حسن نے اسے دیکھ کر بے اختیار۔

"آئم سوری" کہا اور باہر نکل گیا۔

ان کے جاتے ہی سب نے ایک بار پھر اس پہ نظریں جمادیں اور سوال جواب کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہوگیا۔ ایک طرف دادی شروع ہوئیں دوسرے طرف ہاشم بخاری غصے سے اسے پہلے ہی گھور رہے تھے۔ قاسم بخاری کی آنکھوں میں بھی بے اعتباری کے رنگ نمایاں تھے طلحہ ابھی تک سرخ چہرے اور سرخ آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا اس نے سب کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی ماں کی طرف دیکھا تھا، وہ اسے دیکھتی مسلسل نفی میں سر ہلاتیں، بس روئے جارہی تھیں۔ وہ تیزی سے ان کی جانب بڑھی۔

"امی میرا یقین کریں میں اس شخص کو جانتی تک نہیں، میں نہیں جانتی کہ وہ کون ہے، کہاں سے آیا ہے اور یہاں کیوں آیا ہے۔ مجھ سے چاہیں قسم لے لیں۔ میں واقعی۔"

"ارے یہ بہلاوے بچوں کو دینا۔ ہم نہیں تیرے ان فضول اور بے تکے بہانوں میں آنے والے، اس کو گھر کی راہ دکھادی، یہاں تک بلالیا اور پھر بھی مکر رہی ہے بے حیا لڑکی۔" دادی تو گویا چھت کو چھو رہی

تھیں۔
"دادی میں سچ کہہ رہی ہوں۔" وہ دادی کی جانب مڑی اور اپنی صفائی پیش کرنا چاہی۔
"ارے جا' جا تیرا کوئی بھی روپ ہم سے چھپا ہوا نہیں ہے' جانتے ہیں ہم سب' تو نے ہاشم کی عزت کو بٹا لگا دیا۔ اسے کہیں کا نہیں چھوڑا اور کچھ نہیں اتنا تو خیال کر لیتی کہ اس گھر کے ٹکڑوں پہ پلی ہے' وہ ٹکڑے حرام کے تو نہیں تھے۔ اور یہ میرا پوتا۔" انہوں نے مڑ کر طلحہ کی طرف اشارہ کیا۔
"تیرا منگیتر نہیں خصم ہے تیرا۔ اس کی عزت و غیرت کا جنازہ نکالتے ہوئے تھے ذرا شرم نہ آئی۔" دادی کے کہنے کی دیر تھی کہ طلحہ جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا' تیزی سے اس کے پاس سے گزرنے لگا کہ بے اختیار اس نے اس کا بازو پکڑ لیا۔
"طلحہ آپ تو میرا یقین کریں۔" اس نے ایک آس' ایک امید سے اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔
"کیا یقین کروں' میں نے تو خود تمہیں اس کے ساتھ دیکھا تھا سباس۔ پھر بھی کہتی ہو۔" ٹوٹے ارمانوں اور بکھرے اعتماد' اعتبار کی کرچیاں تھیں اس کے لہجے میں جو سباس کو ایک ہی وار میں لہولہان کر گئیں۔ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔ وہ اپنا بازو چھڑانے لگا تھا جب اس نے اپنی گھٹی گھٹی آواز میں "نہیں' نہیں" کہا تھا اس نے جھٹکے سے اپنا بازو چھڑانا چاہا۔ مگر وہ ایسا کر نہیں سکا کیونکہ سباس وہیں گر پڑی تھی' وہ اسے سہارا بھی نہ دے سکا۔

☼ ☼ ☼

"ایسے مت کرو سباس۔ مت جاؤ اس گھر سے۔ ہم سب تمہارے بغیر کیا کریں گے۔" اسے سامان باندھتا دیکھ کر ندا رو ہانسی ہو رہی تھی۔ وہ سامان چھوڑ کر اس کے پاس آ بیٹھی۔
"مجھے مت روکو ندا' اب میں اس گھر میں نہیں رہ سکتی۔ اس گھر نے مجھ پہ اعتبار' اعتماد اور یقین کر کے بجائے مجھے ذلیل' رسوا کر کے رکھ دیا ہے۔ کیا تم سوچ سکتی ہو کہ سباس۔ سباس ایسی گری ہوئی کوئی حرکت کر سکتی ہے' کیا میں بچی ہوں' میں نہیں جانتی عزت کیا ہوتی ہے اس کا جنازہ کیسے نکلتا ہے۔ کیا میں اس سے ناواقف ہوں کہ ماں باپ کی عزت کیا ہوتی ہے۔
ندا اس گھر نے مجھے سہارا تو دیا ہے مگر ہمیشہ مجھے رسوا کیا ہے۔ کیا میں اتنی بری ہوں کہ بائیس سال سے یہاں رہ رہی ہوں مگر پھر بھی کسی کے دل میں زرا برابر بھی اپنے لیے جگہ بنا سکی نہ عزت۔ ہر کوئی مجھے بے اعتباری اور شک کی نظر سے دیکھتا ہے۔ ہر کسی میں بری لگتی ہوں۔ ایسا کیوں ہے ندا۔ ہر کوئی مجھ پہ کیوں شک کر رہا ہے۔"
"سباس یہ وقتی باتیں ہیں۔" ندا نے اسے سمجھانا چاہا تھا۔ وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔
"نہیں ندا۔ یہ وقتی باتیں نہیں ہیں' مجھ پہ شک کیا گیا ہے' مجھے بے اعتبار کیا گیا ہے۔ تم نہیں جانتیں مجھے اندر سے کاٹ ڈالا گیا ہے' میرے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے ہیں۔ میں اندر سے مر گئی ہوں ندا میں اندر سے موت ہو چکی ہے۔"
وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تو ندا کو کچھ سمجھ نہ آیا کہ کیا کہے' کس طرح اس حوصلہ دے' کن جھوٹی تسلیوں اور دلاسوں سے اسے بہلائے۔ اسے ساتھ لگائے بس اس کی پشت تھپکتی رہی۔
کچھ دیر بعد باہر گاڑی کا ہارن بجا تھا غنی نے اندر آ کر سیٹھ ظفر اللہ مرزا کے آنے کی اطلاع دی تھی۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ضویا' مبشرا اور عاصمہ روپڑیں' علی بھی آنسو بہاتا بس اسے دیکھتا رہا۔ وہ سب کے گلے مل کر خاموشی سے بیگ اٹھا کر باہر نکل گئی۔ اس کی ماں پورچ کے دروازے میں کھڑی اسے دیکھ رہی تھیں۔ وہ خاموشی سے چلتی ہوئی ان کے پاس آن رکی۔ دونوں کچھ دیر تک ایک دوسرے کو ڈبڈبائی آنکھوں سے

بھتی رہیں پھر تڑپ کر ایک دوسرے کے گلے لگ گئیں۔
"مجھے معاف کر دینا بیٹا میں تمہارے حق میں آواز اٹھا سکی۔ حالانکہ جانتی ہوں تم بے گناہ ہو۔؟؟"
انھوں نے روتے ہوئے کہا تھا۔ وہ کچھ بول نہ سکی' خاموشی سے وہاں سے ہٹی اور سامنے کھڑی گاڑی کی طرف چل پڑی۔ اسی پل باہر سے ایک گاڑی آئی تھی' اس سے اگلے ہی پل ڈاکٹر طلحہ برآمد ہوا اس نے نظریں اٹھا کر صرف ایک پل کے لیے اسے دیکھا اور پھر سر جھکا کر گاڑی کے کھلے دروازے سے اندر بیٹھ گئی۔

اس کے بیٹھتے ہی سیٹھ ظفر اللہ مرزا بھی اس کے ساتھ بیٹھ گئے ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کر دی جبھی ایک دم سے اس کی نظر بائیں طرف امرود کے درخت کے ساتھ بندھے بکرے پر پڑی تھی۔ اس نے فوراً گاڑی رکوائی اور تیزی سے باہر نکل گئی سیٹھ ظفر اللہ نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ وہ دوڑتے ہوئے بکرے کے پاس جا بیٹھی۔

"غنی اس کا خیال رکھنا اور عید پہ میری طرف سے اس کے ماتھے کے دو پیار لے کر اسے قربان کرنا۔ اس دن بے شک اس کی ایک ران چھپالینا اور پھر عاصمہ سے بھنوا کر کھانا اور وہاں کھاتے ہوئے مجھے ضرور یاد کرنا۔"

اس نے بکرے کو دیکھتے ہوئے ساتھ کھڑے غنی کو گلوگیر آواز میں کہا اور پھر بکرے کے ماتھے کا آخری پیار لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ سامنے کے دروازے میں ندا' مبشرا' عاصمہ' علی اور عالی کھڑے اسی کو دیکھ رہے تھے۔ اس کی ماں ابھی تک کچن کے دروازے کے ساتھ لگی کھڑی رو رہی تھیں اس نے پورے گھر پہ ایک الوداعی نظر ڈالی اور پھر سے گاڑی میں بیٹھ گئی گاڑی اگلے ہی پل باہر نکل گئی۔

"خس کم جہاں پاک۔۔۔" تخت پہ بیٹھی دادی نے ہاتھ جھاڑے تھے' تائی لب بھینچے بیٹھی تھیں۔ طلحہ وہاں سے گزرتا تیزی سے اندر چلا گیا۔

✡ ✡ ✡

سیاہ اندھیری رات
میری راہوں میں حائل ہو چکی ہے
دیکھنے سے رستہ نظر نہیں آتا
چلو بھی تو پاؤں آگے نہیں پڑتا
جانے کہاں سے یہ سیاہ سائے
میری راہوں میں آن بسے ہیں
شاید وہ میری اندر کی موت کو جان چکے ہیں
کہ کتنی آرزوئیں تھیں میری
جو چل گئیں
دو پل میں وہ سب مر گئیں
اب تو جیسے جس رستے پہ بھی چلوں میں
پیروں کے تلووں پہ آبلے پڑتے ہیں
سوچنے سے پہلے ہی پیروں پہ چھالے پڑتے ہیں

بہت خاموشی سے اس کی آنکھ سے ایک قطرہ نکلا' گال کو چھوتا ہوا۔ ٹھوڑی پہ اٹکا اور پھر گریبان میں جذب ہو گیا' اس نے سسک کر وہیں آنکھیں موندیں اور کھڑکی کے پٹ سے پشت ٹکا کر آنسوؤں کا گلا گھونٹنے لگی۔ اسے کسی شخص کی یاد آئی تھی۔ کس کی؟ وہ جانتی تھی انجان بن گئی۔ یاد کو بھی جھٹلا دیا۔

چاہ کر بھی وہ اس گھر اور اس گھر کے مکینوں کو بھلا نہ پا رہی تھی۔ اب یہاں آکر اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس گھر میں اسے جتنی نفرت ملی تھی اس سے دوگنی محبت بھی تو ملی تھی مگر ایک بھاری لمحے نے ایک ہی پل میں اس سے سب کچھ چھین لیا۔

ندا کی دوستی اور پر خلوص محبت' غنی کی بے لوث محبت اور سگی بہنوں جیسا مان' عصمت' مبشرا علی اور عالی کی محبت' پیار' چاہت اور عزت' مان' آغا جان اور تایا جان کے سب بچوں ایسی ہی محبت وہ چاہتی بھی تو یہ سب کچھ نہیں بھلا سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی۔ اب اس کا اس گھر سے کوئی تعلق نہیں رہا۔

وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وہ گھر چھوڑ آئی ہے اس گھر کو

خیر آباد کہہ آئی ہے مگر پھر بھی دل نہ جانے کیوں ادھر ہی ہمک رہا تھا۔ حالانکہ جو کچھ اسے یہاں ملا تھا وہ اس کے خواب میں بھی کبھی نہ آیا تھا یہاں آکر اسے صرف سگا باپ ہی نہیں ماں بھی ملی تھی جو اس کے باپ کی دوسری بیوی تھیں مگر اسے سگی ماں جیسا پیار اور مان دے رہی تھیں۔

جس دن سے وہ یہاں آئی تھی اس دن سے وہ اس کے ساتھ چپکی ہوئی تھیں۔ گھر میں درجنوں نوکر موجود تھے مگر پھر بھی وہ خود اپنے ہاتھوں سے اس کے لیے ناشتا تیار کرتیں' اس سے پوچھ کر اس کی پسند کا دوپہر کا کھانا بناتیں رات اس کی مرضی اور چاہ سے ڈائننگ ٹیبل سجاتیں۔ ہر پارٹی اور ڈنر میں اسے ساتھ لے کر جاتیں' ہر کسی کے سامنے اسے بیٹی کہہ کر متعارف کراتیں۔ وہ اپنے اتنے ناز نخرے اٹھائے جانے پر بجائے خوش ہونے کے اداس سی ہو جاتی۔ اپنی پچھلی زندگی جو آنکھوں کے سامنے ناچنے لگتی تھی پھر کیسے وہ خوش ہوتی۔ کیسے اس سب پر نازاں ہوتی۔

جہاں آرا اسے خوش اور مطمئن دیکھنے کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہی تھیں' ہر دوسرے تیسرے دن اسے شاپنگ پر لے جاتیں۔ مہنگے سے مہنگا کپڑا' مہنگے سے مہنگا جوتا لے کر اسے دیتیں۔ قیمتی کاسمیٹکس کا سامان بیش بہا قیمت کے جدید اسٹائلش بیگز' بہترین عمدہ جیولری منٹوں میں خرید کر اس کے پیروں میں ڈھیر کر دیتیں مگر پھر بھی اس کی آنکھوں میں موجود نمی اور اداسی کہیں پیچھے چھپنے کا نام نہ لے رہی تھی۔ اور وہ چاہ کر بھی اسے کم نہ کر پا رہی تھیں۔ اس کی اداسی انہیں اداس کر رہی تھی بے شک وہ دوبارہ اس گھر میں نہیں جانا چاہتی تھی۔ اس گھر کو دیکھنا تک نہیں چاہتی تھی مگر اس دل کا کیا کرتی جسے اس گھر سے نہیں اس گھر کے مکینوں سے محبت تھی۔ اور مکین بھی ایسے جنہیں وہ کبھی بھی بھلا نہیں سکتی تھی۔ آخر بائیس سال وہاں ان کے ساتھ رہ کر گزارے تھے' چاہتی بھی تو وہ انہیں بھلا نہیں سکتی تھی۔ اور اس سب سے پرے قدرے دور وہاں کے لیے دل مچلنے کا ایک اور بہانہ بھی تو تھا بے نیازی بے گانگی کے باوجود بے مہری بے اعتنائی کے باوجود دل جس کا اسیر تھا۔ پہلے باخبری بھی بے خبری تھی اب بے خبری میں باخبری تھی سنگ دل' ظالم اور بے مہر شخص۔ جو اس سے وقت اکھڑا اکھڑا اور بے زار رہتا۔ جانے کب کیسے کس وقت' اس کے دل پہ قابض ہو گیا پہلے پہل اس سے خار کھاتی تھی' اس سے بھاگتی تھی۔

مگر پھر جانے کب اس کی طرف کھنچتی چلی گئی خود کو خبر ہوئی نہ کسی کو پتا چلا۔

اسی لیے تو اس دن' جس دن اسے ذلیل رسوا جا رہا تھا۔ اس کی ذات و عزت کے بخیے ادھیڑ جا رہے تھے۔ اس کے کردار پہ کیچڑ اچھالا جا رہا تھا۔ نے اک امید اک آس لے کر اسے دیکھا تھا۔ یقین تھا کم از کم وہ اسے رسوا نہیں کرے گا' اس کا یقین کرے گا' سب گھر والوں کے سامنے اس کے حق بول پڑے گا' اس کی بے گناہی کو نا صرف خود مانے گا پورے گھر والوں کے سامنے اسے بے گناہ ثا کرے گا مگر۔

کیا ہوا؟ اس نے تو اس کی امیدوں پہ پانی پھیر اس کی آس نراس کو وہیں ختم کر دیا۔ بولا بھی تو کیا بھی تو کیا۔ نہ اس کا یقین کیا' نہ اسے کوئی مان دیا۔ سب کچھ لمحوں میں ملیا میٹ کر دیا' سب کچھ خاک میں دیا۔ اب وہ سوچتی کاش وہ سب جو اس کے منہ سے ایک جملے کی صورت میں نکلا تھا' وہ سننے سے پہلے جاتی تو اچھا تھا۔

مگر چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ لکھے کو کوئی بدل تو سکتا جتنا اس نے ذلیل ہونا تھا وہ ہو چکی جتنا رسوا ہونا وہ ہو چکی اب تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اور اس دراصل وہ کچھ کرنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اس گھر مکینوں سے محبت اپنی جگہ مگر وہ بھی عزت والی تھی۔ بھی انا رکھتی تھی اگر بخاری ہاؤس والے غیرت مند تھے تو بے غیرت وہ بھی نہیں تھی۔

وہ جانتی تھی اس کے باپ نے دوسری جو شادی وہ عورت کچھ ہی عرصہ بعد اسے چھوڑ کر چلی گئی

اس کا سارا ڈوب گیا' روپیہ پیسہ ہاتھ سے جاتا یہاں تک گھر بھی بک گیا۔ تب اسے ہوش آیا حواسوں میں لوٹا۔ پھر ہاتھ پاؤں مارے' آگے سے قرضہ لیا صفر سے پھر کاروبار شروع کیا۔ جو کامیاب رہتا کبھی بڑا دھچکا لگوا دیتا۔ اور جب طرح سے چلنے لگا۔ تو پھر تیسری شادی کرلی مگر بھی خوشی اسے نصیب نہ ہوئی۔ ساری زندگی کے لیے سسکتا رہا مگر پھر بھی گھر میں کوئی گلاب نہ سکا۔ وہ کامیاب بزنس مین مگر ناکام شخص تھا جس کبھی کوئی سچی خوشی نہیں دیکھی تھی۔ اب جو اتنی سی جوان اولاد ملی تو اس کے پیر زمین پہ نہ ٹک تے اس کی زبان سے نکلنے والا ہر لفظ اس کے لیے حرف آخر تھا۔ مگر جب اس نے طلحہ طلاق لینے کا باپ سے ذکر کیا تو وہ یکدم خاموش خالی خالی نظروں سے اپنی بیٹی کو دیکھنے لگے۔

"ایسا مت کرو بیٹا' یہ اچھا عمل نہیں ہے۔ طلاق کو رسوا کر کے چھوڑتی ہے بندہ کہیں کا نہیں رہتا مول لے کر اس کا دھبا پوری زندگی پیشانی پہ رہتا ہے اور ذلیل و رسوا کرتا رہتا ہے۔ تم ایسا کرو بیٹا۔" انہوں نے اسے بہت سمجھانے کی کی' زمانے کی اونچ نیچ سمجھائی مگر وہ جو ارادہ تھی اس سے پرے ہٹ نہ سکی طلحہ کو خلع بھیج دیا گیا اور اب وہ عدالت کی طرف سے کا انتظار کر رہی تھی۔

شادی کو مضبوط پائیدار اعتبار و اعتماد بناتے ہیں دونوں چیزیں ہی ہم میں نہیں تو پھر اس رشتے کو لے جانے کا فائدہ۔" اس کی دوسری ماں جہاں نے جب اسے سمجھانے کی کوشش کی تو بہت دکھ اس نے کہا۔

جہاں آرا اندر کی بات سے ناواقف تھیں۔ اسی سے اسے دیکھتی رہیں۔ سمانہ بخاری نے فون کیا تو اس نے انہیں اپنے ارادے سے پہلے کر دیا۔ وہ بھی اسے سمجھانا ہی چاہتی تھیں مگر مضبوط سخت لہجے کے آگے انہیں اپنا سمجھانا

دنیا بھر سے منتخب معیاری ادب

عمران ڈائجسٹ

جولائی 2009 کا شمارہ شائع ہوگیا ہے

Emale: id@khawateendigest.com

☆ "پجاری" شیطان کے چنگل میں پھنس کر ماورائی طاقت حاصل کر کے اپنی ناآسودہ خواہشات کی تکمیل کرنے والے ایک شخص کا ماجرا۔ شائستہ وحید کے قلم سے۔

☆ "کارواں" وہ خاندانی وقار رکھتا تھا، وہ ناتجربے کار تھا، مگر معاشرے نے اُسے بہت کچھ سکھا دیا، زندگی کی پیچ راہوں کے مسافر کی تلخ و شیریں داستان، ایم اے راحت کے قلم سے۔

☆ "اورخان" اس تاریخی کہانی میں جہاں جنگوں کا احوال ملے گا، وہیں محبت کی لازوال داستان بھی نظر آئے گی۔ اسلم راہی کے قلم سے تاریخ کے اوراق۔

☆ "آتشِ دل" آخری صفحات پر ایم اے راحت کی معاشرتی تحریر۔

☆ ملکی وغیر ملکی ادب سے انتخاب۔

☆ زندگی کے تلخ حقائق سے منتخب "سچی داستانیں"۔

اس کے علاوہ بہت سی دلچسپیاں

تازہ شمارہ آج ہی خرید لیں

بے سود لگا۔ نداو غیرہ کا فون آیا تو سب ہی افسردگی سے رو رہے تھے' وہ کیا کرتی وہ بھی روتی رہی سب ہی اسے واپس آنے کا کہتے رہے جس پہ وہ افسردگی سے کچھ کہہ بھی نہ سکی حالانکہ کہنا چاہتی تھی کہ اس گھر سے ملنے والا ہر زخم مجھے بھول سکتا ہے مگر آخر میں جو مجھے گہرا گھاؤ لگایا گیا ہے وہ میں چاہوں بھی تو بھلا نہیں سکتی۔

اس دن ایک انوکھی بات ہوگئی۔ وہ جہاں آرا کے ساتھ ان کی دوست کی عیادت کے لیے ہسپتال گئی تو وہاں اس کا ٹکراؤ میر حسن سے ہوگیا۔ وہ تو اسے دیکھتے ہی حیران رہ گیا۔ البتہ اس کی اس پہ نظر پڑتے ہی۔ آنکھوں میں وحشت اتر آئی اس نے اس پہ پہلی نظر ہی نفرت بھری ڈالی تھی۔

"سباس۔" وہ جہاں آرا کے ساتھ سامنے والے کھلے دروازے سے اندر داخل ہو ہی رہی تھی کہ بے اختیار میر حسن نے اسے پکار لیا' اس نے مڑ کر اسے بہت غصے سے دیکھا تھا۔ وہ تیزی سے اس کے قریب آگیا "آپ اندر چلیں' میں آتی ہوں۔" اس نے جہاں آرا سے کہا تو وہ سر ہلاتی اندر چلی گئیں جب کہ اس نے قدم واپس موڑ لیے اس کے اندر وحشتوں کا ایک طوفان اٹھا تھا اور قدم واپس موڑتے ہی اس نے ایک تھپڑ میر حسن کے چہرے پہ لگا دیا۔ جس پہ وہ ساکت رہ گیا۔

"کیوں کیا تم نے ایسا۔ کس گناہ کا بدلہ لیا تم نے مجھ سے۔ بولو کیوں سب کی نظروں میں مجھے گرا دیا۔ میں تو تمہیں جانتی تک نہیں تھی پھر کیوں تم نے مجھے بدنام رسوا کیا۔ کیا بگاڑا تھا میں نے تمہارا کہ تم نے ایسا قدم اٹھایا۔ بتاؤ مجھے کیوں کیا تم نے ایسا۔"

اس نے اسے صرف تھپڑ ہی نہیں مارا تھا بلکہ اسے گریبان سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا تھا اور وہ اپنی جگہ ساکت ہوا ٹکٹکی باندھے اسے دیکھے گیا۔

"مجھے تو تمہارا نام تک معلوم نہیں تھا پھر کیوں۔ کیوں مجھے اپنے نام کے ساتھ بدنام کرا دیا۔ کیا پوری دنیا میں' میں ہی تمہیں ملی تھی تم نے مجھے ہی ذلیل کرنا تھا۔" شعلہ بار نگاہیں اس کے حیران چہرے پہ جمائے وہ برس رہی تھی۔

"مجھے تو پہلے ہی عزت کی ضرورت تھی اور تھوڑی بہت تھی وہ بھی تم نے چھین لی۔ کیا برا کیا میں نے تمہارے ساتھ جو تم نے ایسا کیا۔ بتاؤ مجھے بولو۔"

اب کی بار کہتے کہتے وہ رو پڑی تھی۔ اس کے گریبان پہ بھی اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی میر حسن نے اسے روتے دیکھا تو بے اختیار نفی میں سر ہلانے لگا۔

"نہیں سباس' میں نے ایسا تو نہیں چاہا تھا۔" مسلسل نفی میں گردن ہلاتے ہوئے وہ بولا تھا۔

"تو کیسا چاہا تھا؟" وہ تڑخی۔

"بے شک تم مجھے پہلی نظر میں اچھی لگی تھیں میں نے اسی وقت تم سے شادی جیسے پاکیزہ بندھن باندھنے کا سوچا تھا مگر میں نے یہ صرف تب تک سوچا تھا جب تک میں نہیں جانتا تھا کہ تم کسی کے نکاح میں ہو' اگر میں جانتا ہوتا تو قسم سے میں کبھی بھی اپنے گھر والوں کو تمہارے گھر نہیں بھیجتا۔ یقین مانو جب مجھے یہ پتا چلا کہ تم پہلے سے کسی سے منسوب ہو' کسی نام کی پابند ہو تو میں تو اپنی ہی نظروں میں گر کر رہ گیا بہت پچھتایا کہ میں نے اپنے والدین کو تمہارے گھر کیوں بھیجا۔ مگر تب تک دیر ہو چکی تھی۔"

"تم نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا میر حسن۔ سارے زمانے کی نظروں میں مجھے گرا دیا۔" سرخ برستی آنکھیں اٹھا کر اس نے کہا تھا۔

"بخدا' میں ایسا کچھ نہیں چاہتا تھا۔ میں نے تو اپنی طرف سے ہی تمہارا اور تمہارے گھر کا ایڈریس معلوم کیا تھا اور اسی جلد بازی میں تم سے پوچھے بغیر اپنے والدین کو تمہارے گھر بھیج دیا۔ میں تو سیدھا رستہ اپنانا چاہتا تھا اسی لیے تو کوئی الٹی چلانے کے بجائے اپنے والدین سے بات کر کے تمہارے گھر بھیج دیا مگر میں نہیں جانتا تھا کہ تمہارے گھر والے ایک سیدھی سی بات کو اتنا الٹا لیں گے۔ وہ بجائے ہماری بات سننے کے اپنی ہی طرف سے اتنے غلط اندازے لگا لیں گے۔"

اس سے کہہ رہا تھا اور اسے یقین دلانے کی کوشش
کر رہا تھا۔ مگر روتے ہوئے وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔
"تم نہیں جانتے۔ تمہارے اس چھوٹے سے قدم
نے میری زندگی تباہ کر دی ہے۔ میں سب کو یقین دلاتی
رہی۔ اپنی صفائیاں پیش کرتی رہی مگر کسی نے میرا
یقین نہ کیا۔ سب نے مجھے غلط سمجھا۔ بے غیرت اور
بدکار سمجھا۔ تم تو صرف بات کر کے اپنے گھر چلے گئے
میں پھنس میں گئی۔ مفت میں ہی، خوامخواہ ہی سارے
زمانے کی بدنامی، رسوائی میرے حصے میں آگئی میر حسن
مجھے مفت میں بدنام کر دیا گیا۔"
"ایسا۔ کیا ان لوگوں نے تمہارے ساتھ؟"
"تمہیں بتا کر مجھے کیا ملے گا۔ بس جو ہو گیا وہی کافی
ہے۔ اب میں مزید خود کو کسی کے سامنے گرا نہیں
سکتی۔ تم نے جو کیا میں کبھی معاف نہیں کر سکتی۔"
آنسو پونچھتے ہوئے اس نے سامنے کمرے کی طرف
... بھا دیجیے۔
"لیکن سباس۔"
"پلیز۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے وہیں رکنے کا
اشارہ کیا اور خود اندر چلی گئی۔ میر حسن کسی گہری سوچ
میں ڈوب گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ کچن میں اپنے لیے چائے بنا رہی تھی جب جہاں
آرا نے اسے کسی کے فون کی اطلاع دی۔
"ندا کا ہو گا۔" وہ سوچتی ہوئی چائے کا کپ اٹھا کر
ہال آئی۔
"ہیلو۔" ریسیو اٹھاتے ہی وہ خوش دلی سے چہکی۔
"ہیلو۔"
"کون۔؟" دوسری طرف سے آئی بھاری مردانہ
آواز نے اس کے حواس کھینچ لیے۔ اس نے
آنکھیں پھاڑ کے ریسیور کو دیکھا۔
"ڈاکٹر طلحہ بخاری۔"
"جی۔" اس کا لہجہ سرد تھا۔
"آج شام پانچ بجے اپنے گھر کے قریبی پارک میں
مجھے مل سکتی ہو۔؟" بھاری لہجہ مدھم ہو کے، کتنا
خوبصورت تھا۔
"کیوں۔ کس سلسلے میں؟" اس نے پیشانی مسلتے
ہوئے پوچھا۔
"یہ میں اس وقت بتاؤں گا۔"
"آئم سوری، میں آپ سے نہیں مل سکتی۔" اس
نے اگلے ہی پل فیصلہ سنا دیا۔
"کیوں؟"
"اس بات کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔"
"دیکھو سباس۔"
"سوری، میں کچھ بزی ہوں۔"
"سباس۔" اس نے کچھ کہنا چاہا تھا مگر اس نے
ریسیور رکھ دیا۔

☼ ☼ ☼

"طلحہ تم سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ پلیز اس کی بات
سن لو۔" وہ اپنے کمرے میں بیٹھی کتاب کا مطالعہ
کر رہی تھی، جب جہاں آرا نے آکر منت بھرے لہجے
میں اس سے کہا۔
"امی میں ان سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی، پلیز ان
سے کہیں وہ یہاں سے چلے جائیں۔"
"دیکھو سباس بیٹا وہ تین دن سے یہاں آرہا ہے۔
اور تم اس سے ملنے سے مسلسل انکار کیے جا رہی ہو،
صرف ایک بار اس کی بات سن لو۔ پھر بے شک کبھی نہ
اس سے ملنا۔" جہاں آرا نے ایک بار پھر اس کی منت
کی وہ کتاب بند کر کے انہیں دیکھنے لگی۔
"امی میں نے کہہ جو دیا ہے کہ میں نے اس سے
نہیں ملنا تو نہیں ملنا پھر لمبی بحث کا فائدہ۔ بس آپ ان
سے کہہ دیں کہ وہ یہاں سے چلے جائیں۔ پرسوں
عدالت میں ملاقات ہو جائے گی۔"
"ایک بار اس کی بات تو سن لو کیا پتا وہ اسی سلسلے میں
تم سے کوئی بات کرنا چاہتا ہو۔" جہاں آرا یقیناً
ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھیں۔
"مگر وہ اس سلسلے میں بات کرنا چاہتا بھی ہے تو اب

کوئی فائدہ نہیں۔"

"پاگل مت بنو سباس۔ اگر مسئلہ سیدھی طرح حل ہوجائے تو اسے عدالت میں لے جانے کا فائدہ۔ بہتر نہیں کہ تم دونوں ایک ساتھ بیٹھ کر اس مسئلے کو حل کرلو۔؟"

"یہی تو۔۔۔ یہی تو نہیں ہوسکتا امی۔۔۔ اب ہم ایک ساتھ نہیں بیٹھ سکتے۔۔۔ اس مسئلے کا سلجھاؤ اب صرف عدالت کے پاس ہے۔" اس نے بہت دکھ کے عالم میں کہا تھا جہاں آرا اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

"سباس بیٹا۔ بے شک میں تمہاری سگی ماں نہیں ہوں لیکن میرے دل میں جو تمہارے لیے محبت ہے وہ سگی ماؤں سے بڑھ کر ہے۔ اسی لیے میں چاہتی ہوں کہ میری بیٹی کا گھر بسا رہے' ہمیشہ آباد ہے' تم اپنا فیصلہ کرنے میں خود مختار ہو کیونکہ یہ تمہاری زندگی ہے مگر بیٹی ایک بات یاد رکھنا ایک غلط فیصلہ پوری زندگی تباہ کر چھوڑتا ہے۔ تم اپنے فیصلے پہ اچھی طرح غور کرلو' کہیں یہ فیصلہ غلط ہی نہ ہو۔"

جہاں آرا طلحہ سے معذرت کرنے کے بعد ایک بار پھر اس کے کمرے میں آئی تھیں' تب وہ کھڑکی میں کھڑی گیٹ سے باہر نکلتی طلحہ کی گاڑی دیکھ رہی تھی جہاں آرا نے اس کی محویت محسوس کرکے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر کہا تو وہ گہری سانس لے کر وہاں سے ہٹ گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ سوئی ہوئی تھی۔ جب اس کے اوپر سے کسی نے کمبل ۔۔۔ اتارا۔

"کیا ہے امی سونے ۔۔۔ دیں۔" اس نے بند آنکھوں سے ہی ناگواری سے کہا تو اس کے کندھے پہ کسی نے دو ہتڑ جڑ دیئے اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولی تھیں۔

"بالکل منحوسوں کی طرح پڑی ہو' شرم نہیں آتی ماں کام کاج میں جتی ہے اور بیٹی آرام سے بستر میں گھسی پڑی ہے اپنے کرتوت تو نے نہیں بدلنے۔"

"دادی آپ۔۔۔؟" وہ اچھل ہی تو پڑی تھی۔

"ارے بدبخت آہستہ بول دہلا کے رکھ دیا ہے۔ پہلے ہی میرا دل بہت کمزور ہے یہیں نہ مار دینا۔" دادی نے اس کے اچھلنے اور پھر چلانے پہ دہل کر ہاتھ سینے پہ رکھا تو وہ حیرت سے انہیں دیکھے گئی۔

"ارے دیدے کیا پھاڑ پھاڑ کے دیکھ رہی ہے۔ میں ہی ہوں تیری دادی۔"

"لیکن آپ۔۔۔ آپ یہاں کیوں آئیں؟" اس کی حیرت کسی بھی طور کم نہ ہو پا رہی تھی۔

"کیا میں ۔۔۔ اپنی پوتی کے گھر نہیں آسکتی۔"

"کون پوتی۔۔۔؟ میں تو آپ کی پوتی نہیں ہوں۔"

"اچھا' بائیس سال تک دادی' دادی کہہ کر زبان سوکھتی نہیں تھی اور اب پوتی ہونے سے ہی انکار ہو رہی ہے۔" دادی نے گھور کر اسے دیکھا تو وہ ہونٹ چبانے لگی۔

"دادی شاید آپ غلطی سے یہاں آگئی ہیں۔" اس نے سنجیدگی سے کہا تو انہوں نے جیسے ناک سے مکھی اڑائی۔

"ارے جا۔ میں کیوں غلطی کرنے لگی۔ کیا تجھے بھولا ہوا ہے تیرا یہ گھر۔" انہوں نے اسے کھینچ کر آدھے کمبل سے باہر نکالا۔

"چل اٹھ باہر چل۔ تیری تائی بھی میرے ساتھ ہے اور تیرا باپ بھی کب سے آئے بیٹھے ہیں مگر تیری ماں خدمتوں میں جت گئی بجائے تجھے بلانے کے۔"

"کون باپ ۔۔۔" اسے ایک ہی لفظ سمجھ میں آیا تھا۔

"ہاشم اور کون۔۔۔؟"

"مگر میرا باپ تو ظفر اللہ مرزا ہے۔"

"بے شک ہے' مگر ہاشم بھی تو تیرا ہی باپ ہے اب اٹھ نخرے نہ کر' آباہر' آکے سب سے مل۔"

"نہیں دادی پلیز مجھے کسی سے نہیں ملنا۔ پلیز آپ جائیں یہاں سے۔" اس نے ان سے اپنی کلائی چھڑائی تو دادی اسے دیکھنے لگیں۔

"میں تمہیں لیے بغیر باہر نہیں جاؤں گی'

میرے ساتھ باہر۔" انہوں نے دوبارہ سے اس کی کلائی پکڑی۔

"پلیز دادی۔"

"چلو نا۔ اب اچھا تو نہیں نہ لگتا کہ میں اکیلی باہر جاؤں۔" انہوں نے اسے کھینچنا چاہا مگر اس نے ان سے ایک بار پھر کلائی چھڑالی۔

"دادی مجھے باہر نہیں جانا اور نہ کسی سے ملنا ہے' پلیز آپ جائیں۔"

"یہاں بھی تمہاری عادتیں نہیں بدلیں۔ ضدی اب بھی ہو۔" انہوں نے جیسے افسوس کیا۔

"نانا کہ گئی مجھ پہ ہی ہو مگر میں تو شروع سے ہی ٹھیائی ہوئی تھی۔ تم تو تھوڑی سی عقل رکھتی ہوا سے ہی ذرا کام میں لے آؤ۔" انہوں نے افسوس بھرے لہجے میں کہا تو وہ کچھ نہ بولی۔ دروازے پہ ہلکا سا کھٹکا ہوا تو دونوں ادھر دیکھنے لگیں' تائی مسکراتے ہوئے اندر داخل ہورہی تھیں۔ ساتھ جہاں آرا بھی تھیں۔

"آئم سوری۔ مجھے آپ میں سے کسی سے نہیں ملنا آپ امی کے پاس بیٹھنا چاہتی ہیں تو بیٹھیں۔"

وہ سپاٹ سرد لہجے میں کہتی ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر گھس گئی جبکہ وہ تینوں بند دروازے کو دیکھتی رہ گئیں اس دن نا صرف سمانہ بخاری نے فون کیا تھا بلکہ قاسم بخاری نے بھی بار بار اس سے بات کرنے کی کوشش کی تھی۔ ندا وغیرہ سب گھر بھی آئے تھے مگر اس نے سب سے ملنے سے انکار کر دیا۔ اس شام کو طلحہ نے پھر اس سے ملنے کی کوشش کی مگر اس کا ایک ہی جواب تھا۔ "کل عدالت میں ملاقات ہو گی۔"

☼ ☼ ☼

ہر ایک لمحہ بکھر گیا ہے
ہر ایک رستہ بدل گیا ہے
کوئی جائے تیرے نگر کی مسافتوں کو سمیٹ لائے
تری گلی میں ہماری سوچیں بکھیر آئے
تجھے بتائے کہ کون کیسے اچھالتا ہے وفا کے موتی
تمہاری جانب
کوئی تو جائے
مری زبان میں تجھے بلائے
تجھے منائے
ہماری حالت تجھے بتائے
تجھے رلائے
تو اپنے دل کو بھی چین آئے

اس نے بے چینی سے اپنے بالوں میں انگلیاں چلائیں اور ہونٹ چباتا کھڑکی کے پٹ سے ٹیک لگا کر باہر دیکھنے لگا' اس کی سیاہ گھور آنکھیں اس وقت پانی کے چھوٹے چھوٹے قطروں سے باوضو ہو رہی تھیں اور وہ ان قطروں کو بہنے سے روک بھی نہیں پا رہا تھا یا شاید وہ روکنا چاہتا بھی نہیں تھا۔

"طلحہ گندا ہے۔" اس کے کانوں میں چار سالہ بچی کی آواز گونجی جو ——— اپنے ٹیڈی بیئر چھین لینے پہ تلملا کر اسے گالیاں دینے لگی تھی اور ——— وہ اسے گھورنے لگا تھا جس پہ وہ بچی اور غصے میں آ گئی تھی اور پھر اسی غصے میں اس سے ٹیڈی بیئر جھپٹ کر پڑوس کے گھر میں پھینک دیا تھا۔

یہ صرف اس دن کا معمول نہیں تھا۔ وہ ——— تھی ہی ایسی نہایت ضدی اور اکھڑ مزاج والی۔ جو اس سے ڈرتی نہیں تھی تڑتڑ کر کے ——— جواب دیتی۔ اور اسے چڑاتی ——— چونکہ وہ گھر میں سب سے بڑا تھا اسی لیے سب پہ اپنا رعب رکھنا چاہتا تھا اور وہ اس مقصد میں اچھا خاصا کامیاب بھی تھا کیونکہ گھر کے سارے بچے اس سے ڈرتے اور دبکتے تھے اور وہ سب پہ اپنا رعب جما کر اپنی ہر بات سب سے منوا لیتا تھا مگر وہ چار سالہ بچی جو بقول اس کی دادی کے بہت بدتمیز ہے کو شروع سے ہی ناپسند کرتا تھا کیونکہ وہ اس کے رعب میں نہیں آتی تھی بلکہ اسے کسی خاطر میں لاتی ہی نہیں تھی ہر کام اپنی مرضی اور چاہ سے کرتی تھی' نہ اس سے کوئی مشورہ کرتی اور نہ کوئی رائے لیتی تھی۔ اگر وہ کچھ کہتا تو تڑ کر کے ——— جواب دیتی۔

اسی لیے وہ بچپن سے ہی اس سے خار کھانے لگا

تھا۔ وہ بدتمیز و منہ پھٹ بچی جیسے جیسے بڑی ہوتی گئی۔ اس سے اپنا مقابلہ کرنے لگی۔ اس کے ہر حکم سے انکاری اس کی ہر بات سے رد کروانی ـــــ اپنی اہمیت جتانا' اسے کسی خاطر میں نہ لانا۔ سب بچوں کو ساتھ ملا کر اس سے بدظن کرنا اور خود سب کی فیورٹ باجی' رہنا ـــ یہ سب کچھ طلحہ دیکھتا تو جل کر رہ جاتا۔ مگر اس سب کے باوجود وہ جانتا تھا اور اس بات کو مانتا تھا کہ وہ بہت شوخ چنچل' ہنس مکھ اور بذلہ سنج قسم کی لڑکی ہے ہر کسی کو خوش رکھنے کی بھرپور کوشش کرتی ہے خود تو ہنستی مسکراتی ہی ہے باقی سب کو بھی مسکرانا اور ہنسانا چاہتی ہے۔ کبھی کبھی اس کا بھی جی چاہتا وہ اس کی کمپنی میں شامل ہو جائے اور جس طرح وہ خود ہنس ہنس کر سب کو ہنسا رہی ہے وہ بھی ساتھ ہنسے مگر شروع سے ہی اس کے اندر جو عادت زور پکڑ چکی تھی وہ اسے آگے بڑھنے سے روک دیتی اور اسے اس کے قریب نہ ہونے دیتی۔ اور یہ بات اسے اچھا خاصا چڑا دیتی۔

پھر کچھ ہی عرصہ بعد آہستہ آہستہ اسے محسوس ہونے لگا کہ اس ہنستی مسکراتی لڑکی کی آنکھوں میں اک اداسی ہے' جب وہ ہنستی ہے تو ان آنکھوں کی اداسی مزید گہری ہو جاتی ہے پہل وہ اس اداسی کو دیکھ کر خوش ہوا تھا مگر پھر آہستہ آہستہ اس کی اداسی اسے بھی اداس کرنے لگی۔

"ان خوبصورت آنکھوں میں یہ اداسی کیوں ہے؟" اکثر اس دل چاہتا وہ اس سے پوچھے مگر ان دونوں کے درمیان اتنی بے تکلفی اور دوستی نہیں تھی کہ وہ اس سے یہ پوچھ پاتا۔ پھر خود ہی آہستہ آہستہ نا محسوس طریقے سے اسے محسوس ہوتا گیا کہ وہ اس کے سگے چچا کی سگی بیٹی نہیں ہے۔ اسی لیے گھر میں بڑوں کے درمیان اس کی کوئی اہمیت نہیں۔

گھر والے سب ہی اسے ڈانٹتے ڈپٹتے ہیں مگر وہ اپنی عادت کے مطابق کسی کی ڈانٹ ڈپٹ کو خاطر میں نہیں لاتی اور کسی کو کوئی اہمیت نہ دیتی۔ بس اپنے حال میں مست اور خوش باش رہتی ہے۔ اسے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کوئی اسے کیوں برا بھلا کہہ رہا ہے اور کیوں گالیاں دے رہا ہے طلحہ کو زندگی میں پہلی بار اس کی یہ عادت اچھی لگی تھی۔

"تم اتنا خوش کیسے رہ لیتی ہو؟" اکثر وہ چپ چاپ اس سے سوال پوچھتا۔

(دل ہی دل میں) اور پھر اس کی اداس آنکھوں میں دیکھ کر ہر سوال کا جواب بھول جاتا۔

وقت یونہی گزرتا گیا۔ سب جوان ہوتے چلے گئے اور اسے پتا بھی نہ چلا کب کیسے اور کس وقت ان اداس آنکھوں کی اداسی اس کے اندر اترنے لگی اور ساتھ اسے بھی اداس کرنے لگی۔ نہ جانے کیوں اس کا جی چاہنے لگا کہ وہ خوش ہو تو اس آنکھوں میں بھی خوشی اترے۔

وہ مسکرائے تو اس کی آنکھیں بھی مسکرائیں بہت غیر محسوس طریقے سے وہ اس کے دل میں گھر کرتی چلی گئی جسے وہ جھٹلانے کی خواہش کے باوجود بھی نہ جھٹلا سکا اور دل ہی دل میں اس کا ہوتا چلا گیا۔

وہ شروع سے ہی اپنے لیے کمانے لگی تھی' اس کا جی چاہتا وہ اسے اتنی محنت کرنے سے روک دے جتنے پیسے مہینے بعد وہ کماتی ہے اسے اپنی جیب سے دے دے' اسے ہمیشہ کے لیے کام کرنے سے روک دے منع کر دے مگر جانتا تھا وہ چاہ کر بھی اسے روک نہیں پائے گا کیونکہ وہ بہت انا والی اور خوددار تھی۔ کسی کا احسان نہیں لیتی تھی اندر سے چاہے کٹ جاتی باہر کسی کو اپنی حالت نہیں دکھاتی تھی مگر اس سب کے باوجود وہ یہاں بہت دب کر رہتی تھی۔ شاید یہ دباؤ اس کا یہاں کا فرد ہونے کا نہیں تھا۔ اس گھر پہ اس کا کوئی حق نہیں تھا۔ شاید جبھی وہ تھوڑے سے خوف میں رہتی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ وہ اس خوف سے نکل آئے۔

ابھی ان دونوں کی تعلیم جاری تھی جب آغا جان نے ان کے مستقبل کا فیصلہ کر دیا' جس پہ وہ تو مطمئن تھا مگر وہ بدک اٹھی تھی۔ اس نے اس سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اسے اس کا انکار سن کر برا لگا تھا مگر مزید برا اس وقت لگا جب وہ مان گئی۔ مانی وہ کیسے

تھی۔ یہ بات صرف وہی جانتا تھا۔ اس دن اس کے کچھ مہمان آئے تھے۔ وہ سمانہ بخاری کو چائے کا کہنے ان کے کمرے کی طرف گیا تو ٹھٹک کر باہر ہی رک گیا۔ اندر سے گھٹی گھٹی سسکیوں کی آوازیں آرہی تھیں۔

"اسی گھر نے تمہیں پالا پوسا ہے' سہارا دیا اور اب جو ان کیا ہے نہ تو تم یہاں حق سے رہ رہی ہو اور نہ یہاں تمہارا رہنے کا حق بنتا ہے۔ ان لوگوں کی شکر گزار ہو جنہوں نے میرے ساتھ تمہیں بھی گھسنے دیا۔ اگر یہ لوگ اسی وقت تمہیں اور مجھے یہاں سے دھتکار دیتے۔ اندر گھسنے نہ دیتے تو سوچو کہاں جاتے ہم دونوں' ان لوگوں کے بغیر نہ میرا کوئی رشتہ دار تھا اور نہ کوئی والی وارث' تمہارا باپ تمہیں رکھنے پہ تیار نہیں تھا تو پھر بتاؤ میں تمہیں کہاں رکھتی اور کہاں لے جاتی اب ان سب احسانوں کو فراموش کر کے تم آغا جان کی بات سے انکار کرتی ہو تو ان احسانوں کا حساب کون دے گا' چکائے گا ان احسانوں کو۔" سمانہ بخاری رو رو کر اسے کہہ رہی تھیں اور۔۔۔ وہ سسک رہی تھی۔

"امی بے شک طلحہ اچھے ہیں' مگر میں ان کے ساتھ نہیں رہ سکتی' وہ نفرت کرتے ہیں مجھ سے' شروع سے ہی مجھے ناپسند کرتے ہیں۔

وہ تو مجھے دیکھنا نہیں چاہتے کجا کہ ساری زندگی مجھے ساتھ رکھیں۔ کیوں اپنی ہی کہانی دہرانا چاہتی ہیں۔" اب کی بار اس نے سسک کر کہا تھا۔

"پہلے ہی اپنی منہ سے برے لفظ مت نکالو۔ میں مانتی ہوں طلحہ کو' وہ نہ تو کبھی ظفر بنے گا اور نہ ہاشم کا کردار نبھائے گا۔"

"مگر وہ میری زندگی تباہ کر دے گا' نفرتوں میں پنپنے والے رشتے کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ میں جانتی ہوں وہ مجھے کبھی نہیں قبولے گا امی۔ آپ کیوں مجھے اس سولی پہ چڑھانا چاہتی ہیں۔" اس نے دکھ بے بسی سے کہا تھا۔

"تم سولی پہ اب نہیں تب چڑھو گی جب اس رشتے سے انکار کرو گی' مان جاؤ سباس' کچھ تو اس گھر کے احسانوں کا بدلہ اتارو۔ کچھ تو میرا احساس کرو۔ کیوں احسان فراموش کہلانا چاہتی ہو۔"

"امی اس گھر سے سہارا میں نے نہیں' آپ نے مانگا تھا۔"

"تو میرا ہی کچھ احساس کرلو۔" وہ اندر کی باتیں سنتا وہاں سے ہٹ گیا تھا اسے دکھ ہوا تھا کہ صرف احسان اتارنے کی خاطر سمانہ بخاری اپنی بیٹی کو ان کے حوالے کر رہی ہیں نہ اعتماد نہ اعتبار صرف اور صرف احسان۔

پھر وہ مان گئی۔ آغا جان کی مرضی' خواہش کے سامنے سر جھکا دیا۔ چپ چاپ ان کا حکم تسلیم کر لیا مگر یہ بات طلحہ کو پسند نہیں آئی تھی۔ بے شک وہ چاہتا تھا کہ وہ اس سے شادی کرے' اسے اپنائے مگر اس طرح نہیں ——— یہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ وہ یوں دب کر اپنی مرضی کے خلاف یوں راضی ہو۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ بولے' بے شک انکار ہی کرے۔ مگر اپنے دل کی بات پہ عمل ضرور کرے۔ جیسا وہ اندر سے چاہتی ہے اس کا اظہار بھی کرے۔ وہ ایسے گھٹ گھٹ کر اپنی ماں کی خواہش کے لیے خود کو نہ مارے۔ اپنی زبان کھولے اور آواز نکالے اپنی مرضی سے جیے اور اپنی مرضی چلائے۔

وہ اس سے محبت کرتا تھا جبھی تو ہر کام میں اس کی خواہش اس کی مرضی چاہتا تھا مگر تب اسے بہت افسوس ہوا تھا۔ جب اس نے اپنی ہر خواہش و مرضی کا گلا گھونٹ کر صرف اور صرف دوسروں کی خواہشوں کے سامنے سر جھکا دیا تھا۔ اسی بات پہ اسے غصہ آیا تھا اور وہ دل ہی دل میں اس سے ناراض ہو گیا۔ وہ اسے پہلے بھی ڈانٹتا ڈپٹتا رہتا تھا۔ مگر اس میں اس کے بعد اور زور آگیا۔ وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح تو وہ اس گھر اور اس کے احسانوں کے دباؤ سے نکلے خود کو آزاد محسوس کرے' آواز اٹھائے اور اپنی مرضی سے زندگی گزارے اور کچھ نہ سہی صرف اتنا تو دوسروں کو احساس دلائے کہ میں بھی انسان ہوں' میری بھی کچھ خواہشات ہیں' میں بھی اپنی مرضی رکھتی ہوں۔ اپنے دل کی چاہ پہ جینا چاہتی ہوں اپنی من مرضی سے یہ زندگی

بتانا چاہتی ہوں۔

مگر وہ تو بول کر نہ دی' بس خاموش ہو گئی چپ جو سادھی تو اس پہ قائم بھی رہی' ایسے میں — اس کی چپ اسے غصہ دلاتی اس کی خاموشی اسے ہولا دیتی وہ اس پہ غصہ نہ کرتا تو کیا کرتا۔

اور ادھر وہ سمجھتی رہی کہ وہ اسے ناپسند کرتا ہے۔ اس سے نفرت کرتا ہے' وہ کیسے بتاتا اسے کہ "اسی کے لیے تو وہ ایسا بنا ہے۔"

وہ جانتا تھا گھر میں کبھی اس کی کوئی بات نہیں مانی گئی اس کی کوئی خواہش نہیں مانی گئی جو وہ چاہتی ہے وہ کبھی نہیں اس گھر میں ہوا اسی لیے کبھی کبھار وہ غیر محسوس طریقے سے اس کی خواہش پوری کرنے لگا۔ کبھی اس کی پسند کا کھانا بنوانے لگا' کبھی اس کے پسندیدہ ریسٹورنٹ میں سب ینگ پارٹی کو کھانا کھلانے لگا۔ اسے جو پودے اور درخت پسند تھے وہ بہت غیر محسوس طریقے گھر میں لے کر لگانے لگا۔

وہ فی الحال —— رخصتی نہیں چاہتی تھی اسی لیے اس نے سب کے اصرار کے باوجود صرف اس کی خواہش کی خاطر رخصتی کو التوا میں ڈال دیا۔ آغا جان کی ناراضی کے باوجود اس نے صرف سباس کی خوشی کو اول جانا۔

وہ اسے صرف خوش دیکھنا چاہتا تھا اسی لیے جب غنی کی مہندی کے دن سب کے کپڑے سل کر آ گئے اور صرف اس کے نہ پہنچے' وہ کتنی اداس ہو گئی تھی۔ دادی اور ہاشم بخاری نے بھی اسے ڈانٹ دیا تھا۔ وہ رونے کے قریب ہو گئی تھی تب طلحہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تو جیسے اندر سے ڈھے گیا۔ کتنی ٹوٹی ہوئی لگ رہی تھی وہ کتنی بکھری ہوئی۔ وہ تڑپ ہی تو گیا تھا پھر اسی نے اسی وقت ٹیلر کو فون کیا اور اسے دوگنی سلائی دینے کا وعدہ کر کے فوراً" اس کے کپڑے گھر منگوائے وہ اسے صرف اور صرف خوش مطمئن اور شاداں دیکھنا چاہتا تھا اور جب وہ نئے کپڑے پہن کر مہندی کی تقریب میں چمکتی گاتی آئی تو وہ اندر تک سرشار ہو گیا تھا اس دن وہ ساری رات اس کی آنکھوں کے سامنے ہی تھی اور وہ اسے دیکھ دیکھ کر تن من کو پرسکون و مطمئن کرتا رہا۔

اور اسی خوشی میں جب اس نے "فورٹ منرو" جانے کا کہا تو سب کے اعتراض کے باوجود اس نے "فورٹ منرو" جانے کو ہی ترجیح دی' جب ہی تو ان کا چھوٹا سا قافلہ "فورٹ منرو" پہنچ گیا تھا اور وہ اسے وہاں خوش باش اور چمکتا دیکھ کر خود کو کتنا ہلکا پھلکا اور مطمئن محسوس کر رہا تھا مگر اس اطمینان میں اس وقت ہلکی سی لرزش پیدا ہوئی جب اس نے "ڈائنا جھیل" کے قریب سباس کو کسی اجنبی مرد کے ساتھ چلتے دیکھا اور نا صرف چلتے دیکھا بلکہ باتیں بھی کرتے دیکھا۔

فطری طور پر اسے یہ بات بہت بری لگی تھی مگر چونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ یونہی لاپرواسی ہے' اسی لیے اس نے اسے دبے لفظوں میں سمجھانا ضروری سمجھا مگر اس نے اسی لاپروائی میں اس کی یہ بات اڑا دی —— اور پھر وہ اجنبی اسے "پیالہ" پہ بھی اس کے قریب کھڑا نظر آیا اور یہ صرف وہیں نظر نہ آیا بلکہ جب وہ لوگ وہیں درختوں میں گرسیوں پہ بیٹھے چائے اور پکوڑے سموسے کھا پی رہے تھے' اس نے اس شخص کو ایک بار پھر وہیں چکراتے دیکھا' تب وہ ٹھٹکا تھا۔ بے اختیار اسے اس شخص پہ غصہ آیا تھا' وہ سباس کی جانب سے مطمئن تھا۔ جانتا تھا کم از کم یہ اس کی شہ نہیں لیکن پھر بھی وہ اسے ایک بار پھر تنبیہہ کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ

اس دن "فاطمہ جناح پارک" سے واپسی پر وہ غائب ہو گئی اور اس کی غیر موجودگی نے جیسے اس کی روح کھینچ لی تھی۔ اس وقت وہ خود کو سنبھال نہ پا رہا تھا۔ اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر کتنا ہلکان ہو گیا تھا وہ' کتنا تھک گیا تھا مگر پھر بھی وہ ساری رات اس کے لیے وہاں چکراتا پھرتا رہا۔ کتنی خوفناک وڈراؤنی رات تھی وہ۔ کتنے خوفناک اندیشے' خدشے ذہن میں بار بار آ کر اسے ڈراتے رہے' کبھی اس کے کھائی میں گر جانے کا خیال آتا' کبھی اس کے اغوا کا وہم ستاتا۔ کبھی اس کے مر جانے کا خوف دل میں گھر کر لیتا تو کبھی اس کی لاش کبھی نہ

ملنے کا خدشہ دل و ذہن کو جکڑ لیتا۔ ان سب سوچوں نے مل کر اسے اندر سے توڑ دیا تھا۔

اس دن وہ بہت نڈھال ہو گیا تھا۔ تھکن سے چور چور ہو گیا تھا۔ وہ جانتا تھا وہ طوفانی بارش اور گہرے اندھیرے والی رات سے بہت ڈرتی ہے' اسی لیے تو وہ حال سے بے حال ہوا طوفانی بارش' تیز ہواؤں اور کڑکتی بجلی میں بالکل اجنبی جگہ پہ اسے ڈھونڈتا پھر رہا تھا اور جب وہ ملی تھی تو اسے لگا جیسے اسے آب حیات مل گیا ہو۔ جسم میں روح واپس اور دوسری زندگی مل گئی ہو۔ اس کی سسکیوں پہ دعائیں مانگتا وہ کس قدر تیزی سے اس کے قریب ہوا تھا اور پھر اسے صحیح سلامت زندہ دیکھ کر کتنا تڑپ کر اسے سینے سے لگایا تھا' تب اس کا جی چاہا تھا وہ اسے یونہی ہمیشہ کے لیے سینے میں چھپا لے' اسے کہیں اندر ہی چھپا لے' وہ اسے ساتھ لگائے بے خود سا ہو گیا تھا' نہ اسے اپنا ہوش رہا تھا اور نہ اس کا خیال۔ بس وہ اسے ساتھ لگائے تھپکتا رہا اور اس کے ساتھ ساتھ خود کو بھی تسلی دلاسا دیتا رہا تھا۔

اس دن اسے پتا چلا کہ وہ اسے کتنا چاہتا ہے' اس سے کتنی محبت کرتا ہے۔ اصل میں اسے اسی دن خبر ہوئی تھی کہ وہ اس کے لیے کتنی اہم ہے۔ تب اس کا دل چاہا' وہ اسے اس اہمیت کے بارے میں بتائے۔ اسے بتائے کہ وہ اس کے دل میں کیا مقام رکھتی ہے۔ اس کے لیے دل میں کتنی جگہ ہے' وہ اسے کتنا چاہتا ہے اور وہ اس سے کس قدر محبت کرتا ہے۔ وہ ان ہی دنوں میں اسے بتانے کا ارادہ رکھتا تھا کہ وہ بھیانک سانحہ ان سب کے ساتھ پیش آیا۔ نہ جانے کدھر سے وہ اجنبی شخص سباس کا خواستگار بن کر آنکلا۔ اکیلا آتا تو اور بات تھی' وہ تو ساتھ اپنے ماں باپ کو بھی لے آیا تھا۔

کس کے کہنے پہ وہ یہاں چلا آیا تھا؟

کس کی یہ شہ تھی کہ وہ یہاں تک چلا آیا اور [illegible] چلا آیا بلکہ دھڑلے سے رشتہ بھی مانگ لیا۔ اس [illegible] کر اس کی کنپٹیاں سلگ اٹھی تھیں۔

رگوں میں دوڑتا خون اندر ہی اندر ٹھوکریں مارنے لگا تھا۔ آنکھوں میں عجب چبھن اور دل میں سوئیاں سی چبھنے لگی تھیں۔

ہاشم بخاری نے سباس کو نا صرف وہاں سب کے سامنے بلایا تھا بلکہ اس سے ''اندر کی بات'' بھی پوچھی تھی۔ جس پہ وہ ہکا بکا کبھی ایک کی شکل دیکھتی اور کبھی دوسرے کی' وہ حیران تھی کہ یہ سب کیا ہے' اس کے متعلق یہ سب کیا کہا جا رہا ہے کون سے الزام اس پہ لگائے جا رہے ہیں۔ اسے کیوں سب کے بیچ یوں رسوا کیا جا رہا ہے۔ اس کا قصور کیا ہے؟ اس نے کیا برا کیا ہے؟

وہ حیران حیران سی اپنی صفائیاں پیش کرنے لگی تھی' سب کو اپنا یقین دلانے لگی تھی۔ ہر ایک کی آنکھوں میں بے یقینی دیکھ کر ــــ وہ بوکھلا گئی تھی۔ کس قدر پریشان ہو گئی تھی۔

اپنا اور اپنی ذات کا یقین دلاتے دلاتے اس کی خوبصورت آنکھوں میں کتنے آنسو آگئے تھے۔ اپنی بے بسی پہ کتنا وہ ٹوٹ گئی تھی' تب وہ سرخ آنکھیں لیے صرف اسے دیکھتا رہا' منہ سے کچھ نہ بولا بے اعتبار آنکھیں اس پہ جمائے رکھیں۔ تب۔ تب وہ چاروں جانب سے مایوس ہو کر نا امید ہو کر اس کی جانب لپکی تھی۔ اسے اپنا یقین دلانا چاہا تھا۔ اسے سب سچ بتانا چاہا تھا۔ مگر اس نے کیا کیا۔ ایک ہی وار میں اسے گرا دیا۔

اس کی آخری امید بھی توڑ دی۔ ذرا سی جو آس باقی تھی وہ بھی اس سے چھین لی۔

اس نے اگلے ہی پل دیکھا اس کا وجود ڈگمگا گیا تھا۔ آنکھوں میں شدید تکلیف اور چہرے پہ اذیت چھا گئی تھی۔ کتنی بے یقینی سے اس نے اسے دیکھا تھا جیسے اسے توقع نہیں تھی کہ وہ اسے بے اعتبار کرے گا۔ اسے صفائی کا کوئی موقع دیے بغیر اس پہ لگائے گئے الزامات کی تائید کرے گا۔ نفی میں سر ہلاتے ہوئے کس قدر دکھ درد سے وہ اسے دیکھ رہی تھی کتنی اذیت تکلیف سے اسے دیکھ رہی تھی تب ایک لمحے کے لیے اس کا دل وہیں بند ہو گیا تھا۔ وہ گر گئی تھی اور وہ چپ

ہوگیا۔

پھر اگلے ہی دن وہ جھولی میں ذلت رسوائی کے پھول ڈالے اپنے باپ کے پاس چلی گئی۔ جسے وہ جانتی تک نہیں تھی جس کے پاس جانے سے وہ مرنا بہتر سمجھتی تھی۔

وہ جانتا تھا اگر سارا گھر بھی مل کر اسے وہاں جانے کے لیے مجبور کرتا تو تب بھی وہ وہاں نہ جاتی مگر تب۔ تب اسے جانا پڑا کیونکہ یہاں سے اسے جو کچھ ملنا تھا وہ مل گیا۔ اب وہ کس لیے یہاں رہتی۔ کس برتے پہ یہاں بستی۔ وہ چلی گئی۔۔۔ بہت چپ چاپ۔۔ بہت خاموشی سے۔۔۔۔

دوبارہ نہ کسی کو کوئی صفائی دینے کی کوشش کی اور نہ کسی کو کوئی یقین دلایا۔

پھر کیا ہوا' اس کے جاتے ہی پورے گھر میں خاموشی چھا گئی۔ پورا گھر ہُو کے عالم میں آگیا چاروں اور سناٹے گونجنے لگے۔ ہر طرف چپ نے خوفناک ڈیرا جمالیا۔

پھر گھر میں نہ کسی کی ہنسی گونجی نہ کسی کا قہقہہ بلند ہوا۔ ندا خاموشی سے یونیورسٹی چلی جاتی' نہ اس کے آنے کی خبر ہوتی نہ جانے کی۔

مبشرا اور ضویا پہلے بھی اتنا نہ بولتی تھیں۔ ان کے بولنے یا نہ بولنے سے گھر میں کوئی فرق نہ پڑا۔ لڑکے پہلے ہی گھر سے باہر رہتے تھے انہوں نے کیا' شور شرابا کرنا۔

سمانہ بخاری کو چپ لگی تو وہ ساس کے پاس سے دور دور رہنے لگیں۔ عاصمہ پہلے ہی کم بولتی تھی اور ذرا تنہائی پسند تھی۔ اسی لیے عنی کے آنے تک اپنے کمرے میں ہی بند رہتی۔ تائی کو گھٹنوں میں درد تھا۔ وہ بھی اپنے کمرے میں پڑی رہتیں۔

اور دادی اکیلی باہر تخت پہ پڑی رہتیں۔ نہ انہیں کوئی چھیڑتا اور نہ کوئی چڑاتا۔ وہ سارا سارا دن یونہی چپ کی بکل مارے پڑی رہتیں۔

تھوڑے ہی دنوں میں ـــــ گھر کی خاموشی اور سائیں سائیں کرتے گھرے سناٹے انہیں ہولانے لگے۔ وہ ہر طرف پھیلی چپ کو محسوس کرکے ہول ہول جاتیں۔

"ارے کوئی تو بولے۔ یہ ہر طرف اتنی خاموشی کیوں ہے۔۔۔؟" بے اختیار اٹھ کر وہ سب کو آوازیں دینے لگتیں۔

"اماں سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہیں۔" سمانہ بخاری آہستہ سے کہتیں۔

کچھ ہی دنوں میں انہیں احساس ہوگیا تھا کہ یہ خاموشی کیوں ہے؟ کس کے دم سے ہے اور کس وجہ سے ہے؟

اور یہ احساس صرف انہیں ہی نہیں گھر کے ہر فرد کو ہوا تھا۔ طلحہ جو کبھی اتنا گھر پہ رہا نہیں تھا وہ جان گیا تھا کہ گھر کو بہت گہری چپ لگ گئی ہے۔ وہ ہمہ وقت مضطرب سا بے چینی کے عالم میں کمرے اور بالکونی میں ٹہلتا پھرتا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہ آتا کہ وہ کیا کرے' دل نہ ہسپتال میں لگ رہا تھا اور نہ گھر پہ' بہت بے چین رہنے لگا تھا وہ اور اس بے چینی کو موت کا سا روپ سماس کی طرف سے بھیجے گئے خلع کے نوٹس نے دے دیا۔ اس دن وہ نوٹس ہاتھ میں لیے آنکھیں پھاڑے بے یقینی سے اس پھڑپھڑاتے کاغذ کو دیکھتا رہ گیا۔

اتنی جلدی وہ یہاں تک بھی پہنچ سکتی ہے۔ یہ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا اس دن وہ بستر پہ پڑا تو اگلے تین دن تک اٹھ ہی نہ سکا' سب ہی اسے گہری تشویش اور پریشانی سے دیکھ رہے تھے اس نے اس وقت تو کسی کو نہ بتایا البتہ سمانہ بخاری کو اکیلا پاتے ہی خلع کے کاغذ ان کے سامنے رکھ دیئے۔ جس پہ وہ کچھ نہیں بولی تھیں۔ بس ایک بار شکایت بھری آنکھوں سے اسے دیکھا تھا اور پھر سر جھکا دیا۔

"اس میں میرا کیا قصور۔" وہ ان کے سامنے جھنجلایا تھا۔

"سب قصور میرا ہے کیونکہ میں نے اسے جنا ہے۔" سمانہ بخاری نے سپاٹ لہجے مگر برستی آنکھوں سے اسے کہا تھا۔ وہ کچھ بول نہ سکا اور پھر اس نے ایسی

ای چپ سمانہ بخاری کے پیچھے کھڑے ہاشم بخاری کے چہرے اور ہونٹوں پہ دیکھی تھی اور تب وہ ٹھٹک گیا تھا۔

وہ آنکھوں میں ہلکی ہلکی سرخی لیے زور سے لب بھینچے جیسے بہت تکلیف کے عالم میں لگ رہے تھے تب اس سے رہا نہ گیا تو وہ اس رات انہیں لان میں اکیلے ٹہلتے دیکھ کر ان کے پاس چلا گیا' تب باتوں ہی باتوں میں اس پہ ایک انکشاف ہوا تھا جو اس کے لیے کسی دھماکے سے کم نہ تھا۔

"ان دنوں سمانہ بہت تکلیف میں ہے۔" انہوں نے کہا تھا تب وہ حیرت سے انہیں دیکھنے لگا کہ سمانہ بخاری پہلے کب تکلیف میں نہ ہوتی تھیں۔ وہ جانتا تھا ہاشم بخاری نے ساری زندگی انہیں دکھوں' تکلیفوں اور اذیتوں کی سوا کچھ نہیں دیا۔ پھر اب ایسا کیا ہو گیا تھا کہ وہ ان کی تکلیف پہ اتنے فکر مند ہو رہے تھے۔

وہ ان کے کہنے پہ کچھ نہیں بولا تھا صرف رک کر انہیں دیکھا تھا۔

"جانتے ہو طلحہ میں سمانہ بخاری کو کبھی دکھی نہیں دیکھنا چاہتا۔"

"اچھا۔۔۔"

اس "اچھا" میں تعجب ہی تعجب تھا۔

"لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں وہ ہر بار میری وجہ سے دکھی ہو جاتی ہے حالانکہ میں اسے ہر بار ہی دکھوں اور تکلیفوں سے بچانا چاہتا ہوں مگر پھر بھی ہر بار مجھ سے کچھ نہ کچھ ایسا ہو جاتا ہے کہ سمانہ دکھوں اور تکلیفوں میں گھر کر رہ جاتی ہے جس پہ میں بعد میں پچھتاتا ہوں، بہت پچھتاتا ہوں لیکن تب تک وقت ہاتھ سے نکل چکا ہوتا ہے اور میرے پاس سوائے پچھتانے اور شرمندہ ہونے کے اور کچھ نہیں ہوتا۔۔۔" وہ اس کے ساتھ چلتے چلتے رک گئے۔ اک گہری سانس لی اور سر اٹھا کر چاند کی سمت دیکھنے لگے وہ بھی رک کر خاموشی سے انہیں دیکھنے لگا۔

"ایک بات بتاؤں تمہیں۔۔۔؟" اچانک ہی سر نیچے کر کے انہوں نے اسے کہا تھا۔

"جی۔۔۔"

"جانتے ہو سمانہ میری پہلی اور آخری محبت ہے۔"

"جی۔۔۔؟" اس پہ جیسے حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑ کے انہیں دیکھنے لگا۔ وہ مسکرانے لگے۔

"میں جانتا تھا تم یہ سن کر حیران ہو گے مگر سچ یہی ہے وہ میری شادی کے بعد کی نہیں، بہت بچپن کی محبت ہے۔ تب کی جب اس نے بولنا سیکھا۔ جب اس نے چلنا سیکھا' جب اس نے کھیلنا سیکھا' جانتے ہو جب اس نے بولنا سیکھا تو سب سے پہلے اس نے کس کو پکارا' کس کا نام لیا؟" ہونٹوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ لیے۔ آنکھوں میں یاد ماضی کی پرچھائیاں لیے جیسے وہ بہت دور دیکھ رہے تھے۔ وہ اب کی بار کچھ نہیں بولا' بس انہیں دیکھے گیا۔

"اس نے سب سے پہلے میرا نام لیا' مجھے "آشی" کہا' تب سب حیران رہ گئے اور حیرت سے اسے دیکھنے لگے اور پھر جب دوبارہ اس نے میرا نام لیا تو سب ہنسنے لگے۔ چاچو' چچی' اماں جان' آغا جان' سب مجھے کہنے لگے کہ یہ اس کی ماں ہے جو اس نے سب سے پہلے اسے پکارا ہے۔ اور میں تو تب خوشی سے پھولے نہ سما رہا تھا۔ اسے اٹھا کر خوشی خوشی پورے گھر میں گھومنے لگا۔ اسے چکرانے لگا اور یہ چکر ایسے تھے کہ میں محبت کے چکروں میں آ گیا۔

بچپن سے ہی میں اسے چاہنے لگا تھا' اس سے محبت کرنے لگا تھا۔ وہ مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔ ساری دنیا سے خوبصورت و پیاری ہم دونوں کا بچپن ایک ساتھ گزرا' بہت خوبصورت بہت پیارا' ہم دونوں ایک دوسرے کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اگر اس کے پاس دو کھلونے ہوتے تو وہ ایک مجھے دے دیتی۔ ایک خود رکھ لیتی اور اگر میرے پاس ہوتے تو اسی طرح ہم دونوں آپس میں بانٹ لیتے اسی طرح ہم دونوں ہمیشہ استعمال کی چیزیں آپس میں بانٹتے اور اکٹھے استعمال کرتے

رہے زندگی میں ہم دونوں نے ہر چیز شیئر کی ہے سوائے ایک بات کے۔۔۔

اور وہ بات ایسی تھی کہ نہ وہ مجھے بتا سکی اور نہ میں اسے۔ بس وقت کا انتظار کرتے رہے اور جب وقت آیا تو بے دردی سے ہمارے ہاتھوں کو خالی کر گیا۔

ایک دوسرے کے دل کا حال جانتے تھے مگر پھر بھی خاموش رہے۔ اور ایسے میں وہ بے درد وقت آگیا جس نے نہ کچھ کہنے دیا اور نہ سننے' وہ مجھے دیکھتی رہ گئی میں اسے' آغا جان نے زبردستی اپنے دوست کے بیٹے کے ساتھ اس کی شادی طے کردی' چونکہ آغا جان نے اسے پالا تھا اسی لیے وہ انکار نہ کر سکی اور میں اس کے انکار نہ کرنے پر جھنجلا گیا اور اس سے ناراض ہو گیا۔ وہ کیا کرتی نہ مجھے ناراض کر سکتی تھی اور نہ آغا جان کو' اسی لیے بیمار پڑ گئی۔

شادی تو اس کی ہو ہی جانی تھی سو ہو گئی مگر میں اس سے ناراض ہی رہا۔ دوبارہ کبھی اس سے بات نہ کی۔ وہ یہاں جب بھی آتی مجھ سے ناراضی کی وجہ پوچھتی مجھ سے ڈھیروں شکایتیں کرتی' ڈھیروں گلے شکوے کرتی مگر میں اسے کوئی لفٹ نہ کراتا کوئی اہمیت نہ دیتا۔ اور وہ اسی طرح واپس بھی چلی جاتی۔ پھر کچھ ہی عرصہ بعد ہمیں پتا چلا کہ ظفر اللہ اچھا آدمی نہیں ہے' وہ سمانہ کے ساتھ بہت زیادتی کرتا ہے آئے دن اس سے لڑتا جھگڑتا رہتا ہے یہ سن کر میں بے چین ہو گیا۔ اسے واپس آنے کا کہا مگر وہ پریگننٹ تھی گھر نہیں چھوڑ سکتی تھی اس کے انکار کرنے پہ مجھے بہت غصہ آیا۔

اسی لیے جب وہ بچی کی پیدائش کے بعد ظفر اللہ مرزا کا گھر چھوڑ کر واپس آئی تو میں نے اسے ویلکم نہیں کیا مگر ——— جب اسے طلاق ہوئی ———

——————— تب میں اس کا بہت خیال رکھنے لگا لیکن وہ میرے اس خیال رکھنے کو کسی خاطر میں نہ لاتی اور اپنی بیٹی کو سینے سے لگائے ہر وقت روتی رہتی۔ تب مجھے نا صرف اس پہ غصہ آتا بلکہ اس کی بیٹی پہ اس سے بڑھ کر آتا۔

وہ اس بچی کی وجہ سے اجڑ کر آئی ہے اور اب اسی کی وجہ سے رو رہی ہے یہ سوچ سوچ کر مجھے بچی سے چڑ ہونے لگی اور یہ چڑ اتنی بڑھی کہ جب سمانہ اسے اٹھائے رو رہی ہوتی تو میرا جی چاہتا میں اس بچی کو اٹھا کر کہیں پھینک آؤں۔ یا اس کا سر کسی دیوار پر دے ماروں تاکہ وہ مر جائے اور سمانہ نہ روئے۔ سمانہ کے رونے کی وجہ سے ہی وہ بچی میری چڑ بن گئی تھی۔

اور اس چڑ میں تب اور اضافہ ہو گیا جب اس کی وجہ سے سمانہ نے مجھ سے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔

"میں کسی بھی صورت دوسری شادی نہیں کروں گی۔"

"کیوں؟" قاسم بخاری نے پوچھا تھا۔

"بس میں اپنی بچی کے لیے جینا چاہتی ہوں اور کسی کے لیے نہیں۔" اس نے کہا تھا اور یہ بات میرے دل میں کھب کر رہ گئی۔ یعنی کہ میں اس کے لیے "کسی" ہو گیا تھا ایک دم سے پرایا ہو گیا تھا۔ وہ مجھ پہ اپنی بچپن کی محبت پہ اس چھوٹی سی لڑکی کو ترجیح دینے لگی تھی۔

تب میرا جی چاہا میں اس بچی کا حشر نشر کر دوں آغا جان نے اسے بہت منانے کی کوشش کی بہت قائل کرنے کی کوشش کی مگر وہ مان کر نہ دی اور اس کا مسلسل انکار مجھے بچی کے خلاف کرتا چلا گیا۔

آغا جان نے اس کی کب ماننی تھی اپنی مرضی چلا کر رہے یعنی اسے منا کر رہے لیکن تب تک میں سمانہ سے بدظن ہو چکا تھا۔ اس پہ بہت غصہ تھا اسی لیے میں نے اس سے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ جس طرح وہ نہ مان رہی تھی اسی طرح میں نے بھی اپنے پتھے پہ کسی کو ہاتھ نہ رکھنے دیا۔ مجھے تو غصہ تھا اسی لیے فی الحال انکار کر رہا تھا پھر یہ غصہ ذرا کم ہوا تو چپ چاپ اس سے شادی کر لی لیکن جانے کیوں میں اندر سے مطمئن نہ ہوا۔ شاید اس لیے کہ اسے میری کم اپنی بچی کی زیادہ پروا تھی۔ وہ اولین دنوں میں بھی اپنی بیٹی کو اپنے کمرے میں سلاتی تھی۔ وہ دل سے کبھی بھی میرے پاس نہ آسکے گی' اسی لیے میں چپ سادھ گیا۔ صرف اور صرف سمانہ کی خوشی کے لیے لیکن اس کے باوجود سمانہ مجھ سے زیادہ اپنی بیٹی پہ توجہ دیتی میں اس کی

طرف دیکھتا رہتا اور وہ اپنی بیٹی کے ساتھ لگی کھیلتی رہتی یہی وجہ تھی کہ میں اس سے دور ہوتا چلا گیا' آہستہ آہستہ بے گانہ ہوتا چلا گیا۔ وہ میرے پانچ بچوں کی ماں بھی بن گئی مگر میں اس سے خوش نہ ہو سکا اور میں سارا قصور وار سباس کو گردانتا تھا' حالانکہ میں جانتا تھا کہ اس کا کوئی قصور نہیں' وہ تو معصوم ہے بھلا وہ کیا جانے کہ اس کی ماں صرف اس کی وجہ سے مجھ سے لاپروا ہے نہ میرا خیال رکھتی ہے اور نہ کوئی اہمیت دیتی ہے۔

ظفر اللہ مرزا نے دو تین بار اپنی بیٹی کو واپس لے جانا چاہا تھا' کئی بار مجھ سے رابطہ کیا اور مجھے بچی واپس کرنے کا کہا مگر سمانہ کی خوشی کی پروا تھی ہر بار ظفر اللہ مرزا کو ڈرا دھمکا دیتا۔ اسے وہیں منہ بند کر لینے کا کہہ دیتا۔

ظفر اللہ مرزا فطرتاً" اچھا آدمی تھا میری بات مان گیا اور یہ بات گھر والوں کو پتا ہی نہ چلی کہ کبھی اس نے سباس کو واپس لے جانا بھی چاہا ہے۔ اب جب وہ ایک بار پھر سامنے آیا تو مجھے پھر بھی یہ اچھا نہیں لگا کہ وہ اپنی بیٹی سے ملے اور اسے سمانہ کے پاس سے لے جائے اسی لیے تو میں نے پھر سے اسے بیٹی دینے سے انکار کر دیا لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا کہ وہ چھوٹا سا بہانہ بنا اور سباس یہ گھر چھوڑ گئی حالانکہ میں جانتا ہوں سباس بے قصور ہے وہ کبھی کوئی ایسی حرکت نہیں کر سکتی کہ ہم سب کے سر جھکائے اور یہ یقین مجھے اس لیے ہے کہ اس کی پرورش کسی اور نے نہیں سمانہ نے کی ہے اور میں تو سمانہ سے واقف ہوں۔

میں مانتا ہوں کہ اس نے بچپن سے لے کر آج تک مجھے کوئی شکایت کا موقع نہیں دیا ضویا' مبشرا کی طرح ہمیشہ سگا باپ سمجھا ہے۔ شروع سے ہی میرا بہت احترام کرتی ہے۔ میرے سامنے بالکل سگی اولاد کی طرح سر جھکاتی ہے مگر میں۔۔۔ میں بھی نرا احمق ہوں جو بات شروع سے اس کے خلاف دل میں رکھی اسی پہ آج تک قائم رہا۔ بہت برا ہوں میں' بہت برا' اپنی ہی طرف سے دونوں ماں بیٹی کا دشمن بنا رہا۔"

کہتے کہتے ایکدم سے وہ چپ سے ہو گئے وہ جو ٹکٹکی باندھے انہیں دیکھے اور سنے جا رہا تھا ان کے خاموش ہونے پہ ایکدم سے چونک پڑا۔

"چاچو۔" اس نے کچھ کہنا چاہا تو انہوں نے ہاتھ اٹھا کر اسے کچھ بھی کہنے سے روک دیا۔

"اس کی گواہی میں دیتا ہوں کہ وہ بے قصور ہے وہ بہت معصوم ہے طلحہ۔ بہت بھولی وہ میری سگی اولاد نہیں لیکن اب وہ مجھے سگی اولاد سے بڑھ کر لگنے لگی ہے۔ اب مجھے احساس ہوا ہے کہ وہ ہمارے لیے اور اس گھر کے لیے کتنی اہم ہے دیکھ لو طلحہ گھر میں کتنی خاموشی ہے نہ کوئی ہنسی ہے نہ چہکار۔ ورنہ اس کے ہوتے ہوئے یہاں کبھی خاموشی ہوئی تھی۔ وہ تو بارہ بجے سے پہلے کبھی کمرے میں گئی ہی نہیں۔ لاؤنج میں بیٹھی سب کے ساتھ قہقہے لگاتی رہتی۔ پھلجڑیاں چھوڑتی اور شرارتیں کرتی رہتی۔ اور دن میں بھی کبھی دادی کو تنگ کرتی اور کبھی تائی اور اپنی ماں کو۔ بہت زندہ دل ہے میری بچی لیکن ہم نے اس کے ساتھ بہت برا کیا۔ کسی نے بھی اس کا ساتھ نہ دیا۔ کتنے کم ظرف ہیں ہم طلحہ۔"

طلحہ ہونٹ چباتا کچھ کہہ نہ سکا۔ کہتا بھی تو کیا اس سے محبت کا دعوے دار ہوتے ہوئے بھی اتنا کم ظرف نکلا۔ اس کے حق میں گواہی دینے کی بجائے خود بھی اس کے خلاف بول گیا۔ وہ واقعی کم ظرف تھا اور یہ کم ظرفی اس پہ اس وقت اور عیاں ہو گئی جب چار دن پہلے میر حسن اس کے ہسپتال میں آیا اور اسے سباس کی بے گناہی کا یقین دلانے لگا۔ اس نے اسے سب کچھ صاف صاف بتا دیا تھا اور تب اس کا جی چاہا وہ خود کو اسی وقت ختم کر لے خود کو مار دے۔

اتنی محبت کے باوجود اس نے اس پہ اعتبار نہیں کیا تھا' اسے ذلیل و رسوا کر دیا کتنا بے حس تھا وہ کتنا بے مہر۔

وہ اب جتنا پچھتاتا وہ کم تھا اسی لیے تو وہ اس سے ملنے کا سوچنے لگا' اس سے معافی مانگنے کی کوشش کرنے لگا لیکن وہ ضدی ہو چکی تھی نہ اس سے فون پہ بات کی اور نہ اس سے ملنے کا وعدہ کیا۔ وہ دو تین بار اس کے گھر

بھی گیا مگر اس نے — ملنے سے انکار کردیا آج اس نے دادی' امی اور ہاشم چچا کو بھی اس کے گھر بھیجا مگر سب خالی ہاتھ لوٹ آئے۔

وہ کسی سے نہ ملی' بس عدالت میں ملنے کا کہہ دیا وہ کبھی کسی سے ناراض نہیں ہوتی تھی لیکن اب وہ سچ مچ اس گھر سے ناراض ہوگئی تھی' یہ بات اب سب کو خون کے آنسو رلا رہی تھی سب ہی ایک دوسرے سے چھپ چھپ کے رو رہے تھے۔ اور اس کی بھی یہ رات روتے ہی گزرنی تھی سو وہ ابھی بھی رو رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ شاپنگ پر جارہی تھی۔ خود ڈرائیو کررہی تھی۔ کوئی گاڑی اچانک سامنے آگئی تھی۔ بے اختیار اس کے ہونٹوں سے سسکی نکل گئی۔ گاڑی ایک جھٹکے سے رکی اور کسی نے اس کی طرف کا دروازہ کھول کر اسے بازو سے کھینچ لیا۔

"کک — کیا ہے؟" اس نے پٹ سے آنکھیں کھولیں اور سامنے والے کو دیکھ کر ساکت رہ گئی۔

"نیچے اترو۔" طلحہ نے اسے کھینچ کر نیچے اتارنا چاہا تھا۔ وہ یکدم ہوش میں آئی۔

"کیوں؟ نہیں اتروں گی میں — چھوڑو میرا بازو۔" اس نے جھٹکے سے اپنا بازو چھڑانا چاہا مگر کامیاب نہ ہوسکی کیونکہ آہنی ہاتھ کی گرفت بھی آہنی تھی۔

"میں نے کہا ہے نیچے اترو۔" اب کی بار نا صرف اس نے کہا تھا بلکہ کھینچ کے اسے نیچے اتار بھی لیا تھا۔ وہ گرتے گرتے بچی۔

"کدھر لے جارہے ہو مجھے؟" وہ اسے کھینچنے لگا تو وہ غرائی۔

"بتاتا ہوں — چلو بیٹھو گاڑی میں۔" کھینچتا ہوا وہ اسے گاڑی تک لایا اور اس کا دروازہ کھول دیا۔

"مجھے نہیں بیٹھنا۔" وہ سختی سے اپنی جگہ کھڑی رہی۔

"نہیں بیٹھوگی تو میں زبردستی بٹھالوں گا۔" اس نے صرف کہا نہیں تھا بلکہ اسے اندر دھکیل بھی دیا تھا' اس کا سر ایٹرپنگ سے ٹکرایا تو وہ بلبلا اٹھی۔ اتنے میں وہ دوسری طرف سے ہو کر ڈرائیونگ سیٹ پہ آبیٹھا۔ وہ جھٹکے سے سیدھی ہوئی اور دروازہ کھول کر باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگی۔

"آرام سے بیٹھی رہو' گاڑی اب لاکڈ ہوچکی ہے۔" اس نے گاڑی اسٹارٹ کرکے اس سے کہا تو وہ مڑ کر خونخوار نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"گاڑی روکو۔ اور اتارو مجھے نیچے۔"

"اتاردوں گا' فی الحال آرام سے بیٹھی رہو۔"

"میں نے کہا ہے گاڑی روکو۔"

"اور میں نے کہا ہے آرام سے بیٹھی رہو۔" وہ اطمینان سے بولا۔

"پلیز مجھے تنگ مت کریں۔"

"تم بھی مجھے تنگ مت کرو۔ جانتی ہو نا مجھے شور شرابے سے کتنی چڑ ہے۔" اس نے گردن موڑ کر اس سے کہا تو اس کا خون کھول کر رہ گیا۔ اس کا جی چاہا وہ کوئی بھاری چیز اٹھا کر اس کے سر پہ دے مارے مگر کیا کرتی وہاں سامنے سوائے ٹشو پیپر — اور سی ڈیز کیسٹس کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔

"چلو اترو نیچے۔" وہ گاڑی روک کر بولا تو وہ گردن اور سر اوپر اٹھا کر دیکھنے لگی۔ سامنے وہی عمارت کھڑی تھی جسے اس نے دوبارہ کبھی نہ دیکھنے کی قسم کھا رکھی تھی۔

"آپ مجھے یہاں کیوں لے کر آئے ہیں۔؟" اس نے غصے سے طلحہ سے پوچھا۔

"بتاتا ہوں' پہلے اندر چلو۔" وہ نیچے اتر کر اپنی طرف کا دروازہ بند کرنے لگا۔

"قطعی نہیں — میں مر کے بھی کبھی اندر نہیں جاؤں گی۔"

"مرتی ہو یا پھر زبردستی اتاروں۔" اس کی طرف کا دروازہ کھول کر وہ سختی سے بولا۔

"پلیز۔ مجھے نہیں اترنا تو نہیں اترنا۔ آپ مجھے واپس چھوڑ دیں۔"

"چھوڑ آؤں گا' فی الحال تو اندر چلو۔"

"میں نے کہا ہے کہ میں مر کے بھی اندر نہیں جاؤں گی۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ دیکھ لیتے ہیں تم مرتی ہو یا نہیں۔" کہنے کے ساتھ ہی اس نے ایک بار پھر اسے کھینچ لیا اور پھر اسی طرح کھینچتا ہوا اسے اندر لے گیا۔ اس نے لاکھ بازو چھڑانے کی کوشش کی خود کو چھڑانے میں کامیاب نہ ہو سکی اور وہ اسے کھینچتا ہوا بڑے ہال میں لے گیا جہاں گھر کے سارے افراد جمع تھے۔ اسے دیکھتے ہی ہر طرف کھلبلی مچ گئی۔

"دلین آگئی ہے دلہن۔" کھینچ کر اسے صوفے پہ بٹھایا تو ساتھ بیٹھی دادی نے جھٹ اسے ساتھ لگا لیا۔ وہ ابھی اس جھٹکے سے سنبھلی بھی نہیں تھی کہ تائی جان نے اسے جھپی ——— دے ماری اور پھر اگلے ہی پل ندا اور عاصمہ ہاتھوں میں رنگ برنگی چیزیں اٹھائے اسے اپنی طرف کھینچ کر لے گئیں۔ وہ کیا بولتی وہ تو ہر ایک کے انداز پہ حق دق تھی۔ ہوش تو تب آیا جب اسے کپڑے بدلنے کو کہا گیا۔

"کیا تکلیف ہے میں کیوں بدلوں کپڑے۔۔۔؟" وہ غصے سے چلائی تھی مگر پہلے کوئی اس کی سن رہا تھا جواب سنتا۔

"خاموشی سے پہن لو' ورنہ ڈاکٹر صاحب آجائیں گے۔" ندا نے اسے دھمکایا تو وہ نہایت مشتعل سے انداز میں اسے گھورنے لگی۔

"گھورنا بند کرو اور چینج کرو باہر سب ویٹ کر رہے ہیں۔" ندا میک اپ کا سامان اٹھاتے ہوئے بولی تو وہ کپڑے دور پھینک کر اٹھ گئی مگر اس بار اس پہ صرف ایک نہیں پوری چار لڑکیوں کا حملہ ہوا تھا اور زبردستی اسے کپڑے پہنا دیئے گئے نا صرف کپڑے پہنا دیئے بلکہ میک اپ کر کے زیور تک اس پہ سجا دیا گیا وہ چیختی چلاتی اور انہیں گالیاں دیتی رہ گئی اور وہ لاتعلق اور بے نیازی کی مورتیں بنیں اسے بڑے ہال میں لے آئیں جہاں ہاشم بخاری' قاسم بخاری' علی بخاری' غنی' دادی' تائی اور سمانہ بخاری کے علاوہ ظفر اللہ مرزا اور جہاں آرا بھی تھیں وہ ان دونوں کو وہاں دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"امی۔۔۔ ابو۔۔۔ آپ؟"

"شادی کے دن دلہن نظریں نیچی رکھتی ہے ورنہ روپ نہیں آتا۔" دادی نے فٹ اسے ٹوکا اور اس کا سر ہاتھ سے نیچے جھکا دیا۔ تھوڑے ہی توقف کے بعد وائٹ کاٹن کے کلف لگے سوٹ میں ملبوس گلے میں پھولوں کی مالا ڈالے ڈاکٹر صاحب دولہا بنے اس کے پہلو میں بیٹھے تھے۔

ایک دم سے فلیش لائٹس آن ہو گئیں اور ہر طرف سے موویز اور فوٹو کیمرے نظر آنے لگے۔ وہ آنکھیں پھاڑ کر سب کو گھورتی رہی' منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی رہی ہاتھ کے اشاروں سے سب کو دھمکاتی رہی پھر جب دیکھا کہ آج بس نہیں چل سکتا تو تھک کر سر جھکا دیا۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ
کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت تحفہ

خواتین کا گھریلو انسائیکلوپیڈیا

تیسرا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے

خوبصورت سرورق | مضبوط جلد

آفسٹ چھپائی

قیمت: -/750 روپے
ڈاک خرچ: -/30 روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی

"یہ ہوئی نا بات۔" ڈاکٹر طلحہ کی بے ساختہ کہی گئی بات اس کے کانوں میں پڑی تو وہ مڑ کر اسے گھورنے لگی۔

"شرم کرو۔ ابھی سے ہی۔" عاصمہ نے اسے چھیڑا تو وہ بے بسی سے اپنی خالی ہتھیلیوں کو گھورتی رہ گئی۔ اس کے سوا کر بھی کیا سکتی تھی۔ یہاں تو سب ہی غدار تھے۔

اسے طلحہ کے سجے سجائے کمرے میں لا کر بٹھایا گیا تو عجلہ عروسی کو دیکھ کر اس کے اعصاب جھنجنا گئے سب نے اس کے ساتھ غداری کی تھی اس کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ اور وہ کیسے بے بسی کی تصویر بنی بیٹھی رہی خود پہ ہوتی زیادتی پہ ایک لفظ تک نہ کہہ سکی۔ کتنی بے بس تھی وہ۔ کتنی مجبور، تازہ پھولوں کی لڑیوں سے سجی سیج میں بیٹھی وہ اپنے آنسوؤں کے ساتھ ساتھ کھولتے خون کے گھونٹ بھی پی رہی تھی۔ بار بار اس کا جی چاہ رہا تھا ہر چیز کو تہس نہس کر کے رکھ دے۔ خود پہ سجا سرخ لباس اور زیور اسے کسی کاٹتے ہوئے بچھو سے کم نہ لگ رہا تھا۔ بے اختیار اس کا جی چاہا ہر چیز نوچ کے رکھ دے اور اس بات پہ عمل کرنے کے ——— لیے اسے صرف ایک لمحہ لگا تھا پھر اس نے تیزی سے زیور نوچنے کے لیے ہاتھ بڑھایا مگر اس کے ہاتھ وہیں رک گئے ڈاکٹر طلحہ بخاری اندر آچکا تھا اور اس کے اندر داخل ہوتے ہی نا صرف اس کے ہاتھ رکے تھے بلکہ اس کی سانسیں بھی وہیں رک گئی تھیں۔

وہ دروازے کو لاک کرتا، آہستہ آہستہ بھاری قدم اٹھاتا اس کے مقابل آن بیٹھا بے اختیار اس کا چہرہ جھک گیا۔ کچھ دیر پہلے جو وہ ہر چیز کو تہس نہس کرنے کا سوچ رہی تھی۔ اب ایک ہی پل میں سب ہوا ہو گیا۔

"یہ ایڈونچر بھری رخصتی مبارک ہو۔" آہستہ سے انگشت شہادت سے اس کی ٹھوڑی کو اوپر اٹھاتے ہوئے اس نے مسکرا کر کہا تو اس کی جھکی نظریں اوپر اٹھنے سے قاصر ہوئیں۔

"ویسے میرے لیے یہ ——— حیرت کی بات ہے کہ سباس زوجہ طلحہ بخاری شرما بھی سکتی ہیں یہ شرمانا کہاں سے سیکھ لیا محترمہ سباس صاحبہ۔" اس نے آہستہ سے کہا تھا مگر سباس کو اس میں ایک چبھن محسوس ہوئی اس نے جھٹکے سے سر اوپر اٹھایا تھا وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ سر اوپر اٹھائے ہی اسے گھورنے لگی تھی پھر ایکدم سے وہ اٹھی اور بیڈ سے اترنے لگی مگر طلحہ نے سرعت سے اس کی کلائی پکڑ لی۔

"کدھر جا رہی ہو؟"

"پلیز چھوڑیں مجھے۔ جتنا تماشا آپ لگوا چکے ہیں۔ اتنا ہی کافی ہے۔ اب مزید کی گنجائش نہیں؟" سرخ آنکھوں سے اسے گھورتے ہوئے وہ غرائی اور اپنا بازو چھڑا لیا مگر طلحہ نے ایک بار پھر اسے پکڑ لیا۔

"غصہ۔ اوہ تمہیں غصہ کرنا بھی آتا ہے۔؟" وہ جیسے استہزائیہ ہنسا۔ سباس کو لگا جیسے اس کے اعصاب کی رگوں کو کسی نے الاسٹک کی طرح کھینچ دیا ہے۔ اس نے پھر کلائی چھڑانے کے لیے بازو کو جھٹکا دیا مگر اس بار اس کی چیخ نکل گئی۔ طلحہ نے اس کی کلائی دبا کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ وہ سیدھی اس پہ گری تھی۔ طلحہ نے فوراً اسے اپنی بانہوں ۔ میں بھر لیا۔

"ناراضی۔ اوں ہوں۔ قطعی نہیں۔ تم پہ یہ ناراضی۔ یہ اشتعال۔ یہ غصہ قطعی سوٹ نہیں کرتا جانِ طلحہ تم صرف ہنستی مسکراتی اور کھلکھلاتی ہی اچھی لگتی ہو۔"

"چھوڑیں مجھے جتنا مجھے ذلیل کرنا تھا وہ آپ کر چکے جتنی رسوائی مجھے دینی تھی وہ آپ دے چکے اب مجھے ان بے جا تعریفوں کی کوئی ضرورت نہیں سمجھے آپ۔" وہ اس کے سینے پہ دونوں ہاتھ جما کر پیچھے ہٹی۔

"سمجھ گیا جناب۔ اتنا غصہ دکھانے کی ضرورت نہیں۔" وہ متبسم لہجے میں بولا تو وہ ایک بار پھر اسے گھورنے لگی۔

"ایک تو تم گھورتی بہت ہو۔ قسم سے ڈرا کے رکھ دیتی ہو۔" اس نے ڈرنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا تو

اس کا غصہ مزید بڑھ گیا وہ اس کے مشتعل انداز پہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا اور پھر ہنستے ہنستے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔

"انسان خطا کا پتلا ہے سباس اور غلط فہمی بھی تو انسانوں کو ہی ہوتی ہے۔ اگر اس وقت میں نے تمہارا اعتبار نہیں کیا تھا تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ میں نے خود میر حسن کو تمہارے ساتھ چلتے اور باتیں کرتے دیکھا تھا۔"

"اور اپنی ہی طرف سے اندازہ لگا لیا کہ میں اس کے ساتھ انوالو ہوں۔" اس نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔

"تب میں نے ایسا کچھ نہیں سوچا تھا۔ جانتا تھا تم ایسی نہیں ہو بلکہ ذرا سی احمق اور بے وقوف ہو کم از کم تمہاری طرف سے یہ شہ نہیں ہو سکتی۔" اس کی سنجیدگی سے کہا تو وہ چراغ پا ہو گئی۔

"پھر کیوں سب کے سامنے مجھے بے عزت کیا' میرا اعتبار کیوں نہیں کیا؟"

"اس وقت میں غصے میں تھا مجھے بہت بڑا دھچکا لگا تھا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ شخص یہاں تک آ جائے گا۔ میری جگہ کوئی اور بھی ——— ہوتا تو بالکل میری طرح ہی سوچتا کوئی شخص کیسے دھڑلے سے کسی کے گھر رشتہ لے جا سکتا ہے جبکہ اس میں اگلے کی کوئی رضی بھی نہ ہو' یہی بات سوچ کر مجھے غصہ آیا تھا اور میں تمہاری طرف سے بے اعتبار ہوا تھا مجھے اس میں تمہاری مرضی لگی تھی۔ تمہاری چاہ لگی تھی۔"

"آپ نے یہ کیسے سوچ لیا؟"

"بس جب شیطان دماغ پہ حاوی ہو جائے تو بے اعتباریاں دلوں میں آ ہی جاتی ہیں۔"

"تو کیا یہ بے اعتباریاں اب مٹ گئیں۔" اس نے ماریہ نظروں سے اسے دیکھا تو وہ ہونٹ چبانے لگا۔

"مجھے تم پہ اعتبار پہلے بھی تھا بس نظر کے دھوکے کی بات تھی اور یہ دھوکا صرف ایک ایک لمحے کا تھا اس کی زد میں میری پندرہ سولہ سالہ محبت آ گئی۔"

"محبت...؟"

"سباس تم یقین کرو یا نہ کرو مگر طلحہ کی ساری زندگی تم سے محبت کرتے ہوئے گزری ہے' بہت بچپن سے چاہتا آ رہا ہوں تمہیں۔ بہت بچپن سے محبت کرتا آ رہا ہوں تم سے۔"

"اچھا تو جھوٹ بھی بولنا آ گیا ہے آپ کو؟"

"یہ جھوٹ نہیں بہت بڑا سچ ہے سباس میری محبت کی کہانی سنو گی تو حیران رہ جاؤ گی۔" وہ محبت سے کہتا اسے اپنی ساری رام کہانی سنانے لگا تھا جس پہ وہ بے یقینی سے آنکھیں پھاڑے اسے ——— دیکھے گئی اور پھر آخر پہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

"اتنی محبت کے باوجود بھی آپ ہمیشہ مجھے ڈانٹتے رہے' نہ مجھے خبر ہونے دی اور نہ خود بتایا کتنے برے ہیں آپ طلحہ۔"

"میں نے کہا نا سباس مجھے صرف تمہاری خوشی درکار تھی اور میں صرف تمہاری خوشی کی خاطر ہی وہ سب کرتا رہا۔" اس نے اسے یقین دلانے والے انداز میں کہا تو وہ پھر بھی آنسوؤں کو روکنے میں ناکام رہی۔

"اگر امیر حسن آپ کے ہسپتال نہ آتا تو کیا اب تک۔"

"قطعی نہیں میرا دل پہلے ہی تمہیں پاکیزہ اور پاک دامن مان چکا تھا اور یقین مانو یہ یقین صرف مجھے نہیں گھر کے سب افراد کو تھا اور تو اور ہاشم انکل کو بھی اور جانتی ہو ہاشم چچا کو تم سے چڑ کیوں تھی۔" اس نے نفی میں سر ہلایا تو وہ ان کی بھی محبت کی کہانی اسے سنا گیا اور اسی کی طرح وہ اور بھی حیران رہ گئی تھی اور پھر جب یقین آیا تو بے اختیار مسکرانے لگی۔ جس میں اس نے بھی اس کا ساتھ دیا تھا۔

☆ ☆